یہ کس کی لاش ہے
میرے کفن میں
؟
راجہ نذر بونیاری

"یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں......"

?

راجہ نذر بونیاری

نام کتاب......"یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں؟"

مصنف......راجہ نذر بونیاری

کمپوزنگ......امتیاز شرقی

مطبع......

سرورق: گلوبل لنک کمپیوٹرس 9419707173

ایڈیشن...... پہلا

تعداد اشاعت......

قیمت فی جلد......100 روپے

اس مجموعے میں شامل افسانوں کے کردار اور واقعات فرضی ہیں۔

پتہ......ترکانجن 193122 ،ضلع بارہمولہ

فون...... 9419540803، 01956210600

ایک جسم ایک جان

عبدالقیوم خان

کے نام......

فہرست

اپنی کہانی اپنی زبانی

میں جو کچھ بھی کہوں گا سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔

خدارا میرے بیان کو مبالغہ سے تعبیر مت کیجئے گا۔ میں جو کہانی آپ کو سنانے جا رہا ہوں اس کا مرکزی کردار میں خود ہوں۔ اس کہانی میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جو آپ کو یقیناً مبالغہ لگیں گی اور اگر آپ غور کریں اور تھوڑی گہرائی میں جا کر جھانکیں تو یقیناً آپ ایسے واقعات اور حالات کی جوازیت زمانہ حال میں بھی پائیں گے......

صاحبان! آج سے 55/50 سال پہلے کی بات ہے کہ میں اپنے آبائی گھر میں چولھے کے نزدیک ایک کھڑکی میں بیٹھا الف لیلیٰ پڑھ رہا تھا۔ چولھے کے نزدیک اس لئے کیونکہ چولھے میں آگ جل رہی تھی اور چولھے کے سامنے والے ڈل پر دینی جل رہی تھی جسے کشمیری میں لشی اردو اور فارسی میں چوب چراغ اور انگریزی میں ٹارچ وُڈ کہتے ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں یہ الفاظ متروک ہیں کیوں کہ آج کل لوگ لشی دینی اور چوب چراغ سے واقف نہیں کیونکہ ہر طرف برقی روشنی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دیہات خاص کر ہمارے جیسے علاقوں میں امیر لوگ روشنی کے لئے شام ہوتے ہی لالٹینیں، تیل

خاکی سے جلنے والی چمنیاں یا پھر کھانے کے تیل سے روشن ہونے والے مٹی کے دیئے استعمال کیئے جاتے تھے اور جب تیل دستیاب نہیں ہوتے تھے تو پھر نوبت لشی یا دینی پر آجاتی تھی۔ گرمیوں میں لشی یا دینی کا استعمال زیادہ ہوتا تھا کیونکہ اس کی روشنی پر جو مچھر، پروانے اور دوسرے کیڑے مکوڑے یا پتنگے آ آکر گرتے تھے وہ گرتے ہی جل جاتے تھے......اور سردیوں کی ٹھنڈی اندھیری اور جان لیوا راتوں میں جہاں آتش دانوں میں لکڑی جلائی جاتی تھی وہاں دیا یا چمنی ساری رات جلتا رہتا۔ گھنے جنگلات والے دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں جاڑے کے موسم میں جب شدید برف باری ہوتی تھی تو ہر قسم کے جنگلی جانور جنگلوں سے نکل کر بستیوں کا رُخ کرتے اور رات بھر روزی کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتے اور ڈراونی آواز نکالتے جن سے گھروں کے اندر اندھیرے میں سہمے ہوئے بچے اور بوڑھوں کے دل دہل جاتے۔ یہ جنگلی جانور خصوصاً تیندوے اکثر کُتوں کا شکار کرتے تھے اس لئے لوگ اپنے پالتوں کُتوں کو گھروں کے اندر چھپا دیتے تھے۔ پتہ نہیں کیوں صرف جاڑوں میں لوگ ڈراونے خواب بھی دیکھتے ہیں......میرے گاؤں کے لوگ فنونِ لطیفہ کے بے حد دلدادہ رہے ہیں۔ اس میں گانے والوں اور والیوں کے علاوہ شمشیر و گتکہ باز، شکاری اور قصہ گو بھی رہتے تھے۔ جاڑوں میں لوگ قصہ گوؤں کو اپنے گھر مدعو کرتے اور شام ڈھلتے ہی داستانیں اور قصے سننا شروع کر دیتے۔ رات کے کھانے کے بعد گھر کے سارے افراد کنبہ ایک ہی کمرے میں جمع ہو جاتے۔ آتش دان کو گرم کرتے اور پھر قصہ خوانی شروع ہو جاتی۔ ہمارے قصہ خوان ہمیشہ کہانیاں زبانی سُناتے۔ اسی دوران چائے کے دور بھی چلتے۔ کبھی کبھار بھُنی ہوئی مکی کے دانے یا بھُٹے اور اخروٹ کھائے جاتے۔ بعض اوقات راج ماش کی دال اُبال کر رکھی جاتی اور پھر وقفے وقفے سے سب کو پیالوں میں پروسی جاتی۔ قصہ خواں حضرات درمیان میں منظوم مثنویاں بھی سُناتے......لیکن جان بوجھ کر قصوں کو سنسنی خیز اور

ڈراونا بناتے اور سُننے والوں کے رونگٹھے کھڑے ہو جاتے ۔ یہ داستانیں بزمیہ بھی ہوتیں رزمیہ بھی۔ طربیہ بھی اورالمیہ بھی۔ان دیومالائی داستانوں کے کرداروں میں عام انسانوں کے علاوہ مافوق الفطرت کردار ہونا لازمی ہوتا۔ بادشاہوں' شہزادوں' ملکاؤں' جادوگروں' جنوں' دیوؤں اور پریوں کے علاوہ اُڑتی ہوئی مچھلیاں' گاتی ہوئی بھینسیں بولتے ہوئے طوطوں' دانا مینا' اژدھوں' اوران دیکھی بلاؤں کی کہانیاں......کبھی کبھی بچے رونے لگتے۔ لیکن جادوگروں کے کرشموں کی کہانیاں سن کر خوش ہو جاتے......لوگوں کے پاس کام نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ سردیوں کے دوتین مہینوں میں تو بے کاری سر چڑھ کر بولتی۔ ہر گاؤں سے ایک آدھ آدمی کہیں دور پردیس میں کام کے سلسلے میں گیا ہوتا اور جب وہ واپس آجاتا تو لوگوں کو اپنے سفر کے واقعات اور اُن علاقوں کے حالات کچھ اس طرح سے سُناتا کہ سُننے والا یہ سمجھتا کہ یہ شخص کہیں پریوں اور جنوں کے دیس سے لوٹا ہے۔ میرے گاؤں میں سے دو بزرگ ایسے تھے جو دوسری جنگ عظیم میں برما کے بارڈر پر رہ چکے تھے۔ دو بزرگ برٹش آرمی میں تھے اور مصر اور شام میں رہ چکتے تھے۔ اُن سے اہرام مصر' فرعونوں' کربلا...... حضرت علیؓ کے گرز اور تلوار کی باتیں ہم بار بار سُنتے۔ ایک چچا کئی سال تک پشاور میں رہ چکے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ ترکانجن سے پشاور تک پیدل جاتا تھا اور جب سفر پر روانہ ہوتا تو اپنے ساتھ مکئی کی 200 روٹیاں اور کئی سیر اچار اور گھاس کی بُنی ہوئی جوتیوں یعنی پولوں کے دس پندراہ جوڑے لے جاتا۔ یہ شخص ہمیں کاغان ہزارا' سوات' درہ خیبر اور قبائلی علاقے کے لوگوں کے حالات زندگی سُناتا تو ہمیں شوق ہوتا کہ کاش ہم بھی وہاں جاسکتے۔ ریل گاڑی اور اس کی پٹڑی' ٹیلی فون وغیرہ کی باتیں سن کر ہم کہتے' کیا یہ سب چیزیں کبھی ہم دیکھیں گے؟ اور کیا یہ سب باتیں سچ ہیں یا پھر محض داستانیں۔

تو صاحبو......میں کیا کہہ رہا تھا......ہاں میرے گھر کا چولھا بھی روشن تھا اور اس کے

اُوپر رکھی ہوئی دینی بھی۔ میں دوسرے یا تیسرے درجے کا طالب علم تھا اور الف لیلیٰ پڑھ رہا تھا۔ یہ کتاب میں کئی مرتبہ پڑھ چکا تھا اور بار بار پڑھنے کو جی چاہتا تھا۔ پتہ نہیں اس کے کرداروں سے کچھ ایسی انسیت سی ہوگئی تھی ایسا لگتا تھا کہ یہ کردار ہمارے دوست ہیں۔ ہم میں سے ہیں اور جانے پہچانے ہیں۔ حالانکہ مکانیت اور ناموں کے لحاظ سے یہ سب غیر مقامی تھے۔ الہ دین' سند باد' شاہ زمان' دیو سفید' حُسن بانو' مہر بانو وغیرہ وغیرہ۔ میری والدہ' تین بڑی بہنیں ایک بھاوج' ایک گھریلو خادم اور اس کی بیوی تھے۔ نانی اکثر چرخہ کاتتی اور لڑکیوں کو نصیحتیں کرتی رہتی۔ والدہ میرے لئے روشنی کا بندوبست کرتی ' دادا جان فارسی' کشمیری اور اپنی بولی پہاڑی میں غزلیں اور گیت گاتے۔ حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام' انہیں زبانی یاد تھا۔ اس کے علاوہ گلستان بوستان کی فارسی کہانیاں' محاورے' ضرب المثل' پکی روٹی' مولوی محمد دلپذیر کی احوال الآخرت' میاں محمد بخش کی مثنوی سفر العشق ' قصص المحسنین ' رزمیہ مثنویاں' شاہ بہرام جنگ نامہ زیتون' جنگ نامہ امیر حمزہ' کشمیری کی ہی مال' ناگ راج' اکہ نندن' لیلیٰ مجنون' کلام شمس فقیر' وصمد میر' محمود گامی وغیرہ اکثر گاتے۔ میرے والد صاحب ایک انتہائی سادہ لوح انسان تھے۔ وہ بھی کشمیری صوفیانہ کلام گنگناتے رہتے تھے اور حقہ پیتے ......اپنے کنبے میں سے مجھے جس شخص سے سب سے زیادہ پیار اور محبت تھی وہ میری ماں تھی ۔ میں جب دس سال کا تھا تب بھی اُنہی کے ساتھ سوتا تھا۔ وہ سورہ فاتحہ اور آیۃ الکرسی پڑھ کر مجھ پر پھونک مارتی۔ جب میں الف لیلیٰ پڑھنے لگتا تو وہ کہتیں۔ بیٹا اتنی بڑی موٹی کتاب مت پڑھا کر۔ تم اپنی کتابیں (درسی) پڑھو۔

میں جس رات چولھے کے قریب کھڑکی میں بیٹھا الف لیلیٰ پڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے داہنے گھٹنے کے نیچے مجھے کچھ کھجلی سی محسوس ہوئی پھر درد ہونے لگا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کھرچنا چاہا تو کوئی چیز میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں نے روشنی میں اسے دیکھا تو

مارے خوف کے میرے حلق سے چیخ نکل گئی...... "بچھو"! میری والدہ پریشانی میں بولیں۔ "پھینک دو اُسے" نہیں تو یہ ہاتھ میں کاٹے گا۔ میں نے پھینک دیا تو کسی نے چمٹے سے اٹھا کر دیئے جلتے چولھے میں جھونک دیا۔ میں نے احتجاج کیا کہ یہ بچھو بے چارہ بے قصور تھا۔ غلطی تو میری تھی کہ اپنے گھٹنے سے اُس پر وزن ڈال کر اسے تکلیف پہنچائی تھی۔ مجھے اس بے چارے بچھو کو ایسی سزا دینے پر بہت افسوس ہوا۔ یہ میرے لئے ایک ناپسندیدہ فعل تھا۔ ہمارے گھریلو خادم جبار گنائی نے جھٹ کہیں سے کچھ گھاس لائی اور پھر اسے پتھر کی ایک سل پر رگڑ کر اسکا سفوف سا بنایا اور میرے گھٹنے پر تھوپا۔ پتہ نہیں اس سے مجھے کیا فائدہ ہوا لیکن دوسرے دن میری مزاج پُرسی کرنے کے لئے آنے والوں سے میں نے سُنا کہ ہمارے یہاں کے بچھو زہریلے نہیں ہوتے کیونکہ یہ سرد ملک ہے اور سرد ملک کے سانپوں کے کاٹنے سے بھی کوئی نہیں مرتا۔

یہ سچ ہے کہ میں دوسری جماعت کا طالب علم ہونے کے باوجود اتنی بڑی ضخیم کتاب پڑھ رہا تھا۔ دراصل سکول میں داخلے سے پہلے ہی ہم چند لڑکوں نے کچھ مقامی خواندہ دکانداروں اور رشتہ داروں سے اتنا پڑھ لیا تھا کہ جب سکول میں داخلہ ہوا تو ہم "گاؤں" پر دو صفحات کا مضمون بخوبی لکھ سکتے تھے۔ "خلاصواڑہ" جس سے ہمارے آج کے یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم طلباء بھی واقف ہونگے ہم سکول میں داخلے سے قبل ہی لکھ سکتے تھے۔ خلاصواڑے کا مضمون کچھ اس طرح ہوتا تھا باعث تحریر آنکہ...... منکہ...... ولد...... ساکنہ ...... بہ ہوش وحواس خمسہ تحریر کر کے دیتا ہوں کہ من مظہر نے ایک راس گائے، جس کی پیشانی پر چانڈ گدا زسینگ، سڈول صحت مند بدن بدست...... بعوض...... روپے ضرب ڈبل، جس کا آدھا...... ہوتا ہے فروخت کرتا ہوں...... وغیرہ وغیرہ......

میرے دادا جان ایک ترقی پسند جاگیر دار تھے۔ شاید اسی لئے گاؤں میں بے حد

مقبول تھے۔ گاؤں کا ہر فرد بلالحاظ ذات پات' عمرُ وجنس اُن کے پاس بلاناغہ آتے اور گھنٹوں بیٹھتے۔ اُن کے سامنے اپنے مسائل بیان کرتے اور پریشانیاں Share کرتے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ شادیوں میں بھی لے جاتے تھے۔ اس طرح سے مجھے اپنے بچپن ہی سے سماجی زندگی جینے کا موقعہ ملا اور اپنے لوگوں کی نفسیات جاننے اور سیاہ وسفید کی پہچان بھی ہوسکی۔ درستانوں اور قصوں سے میری دلچسپی میرے افسانہ نگار بننے کا وجہ بنی۔ میری عمر اس وقت بمشکل 10-11 رہی ہوگی جب میں نے ''ناول'' لکھنے کی ناکام کوش کی اور صرف چار سطور سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مطالعے کے شوق کا یہ عالم تھا کہ جو کوئی کتاب ملتی اُسے پڑھے بغیر نہ چھوڑتا۔ داستانوں اور قصہ کہانیوں کے علاوہ میں نے جاسوسی ناولیں بھی پڑھنا شروع کردیا تھا۔ پھر سماجی ناولوں کی باری آگئی۔ پھر اصلاحی ادب' اسکے بعد اسلامی تاریخی ناولیں' رسائل وجرائد ساتھ ساتھ رہتے۔ ساقی' شمع' کھلونا' بیسویں صدی' آستانہ' دین دنیا' میرے مطالعے میں رہنے لگے تھے۔ پھلواڑی کھلونا اور ٹافی والوں کو ابتداء میں خط لکھے۔ جو شائع ہوئے' ممبئی سے ایک رسالہ ''کارٹون'' نکلتا تھا جو مجھے بہت پسند تھا اور میں اس کا خریدار بن گیا تھا اور یہ مجھے بذریعہ ڈاک مل جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے ''طوطا مینا'' گُل صنوبر' گل بکاولی قصہ حسن بانو......وغیرہ جیسی کتابین......مجھ سے دور ہوتی گئیں اور ان کی جگہ شاعر شب خون اور بیسویں صدی جیسے رسائل مطالعہ میں رہنے لگے۔ اسی زمانے میں میرے اندر خرد وجنوں اور دل ودماغ میں فرق کرنے کا شعور پیدا ہوا اور اقبال شناسی کی ہوا سی لگی۔ چونکہ سکولی زندگی کے دوران مجھے بے حد Exposure ملا اور میں نے دوسروں سے سُنا کہ میرے اندر تخلیقی صلاحیت موجود ہے۔ جب میں ہائی سکول کا طالب علم تھا تو سکول میں آئے دن کوئی نہ کوئی ایسی تقریب منعقد ہوتی تھی جس میں سکولی بچوں اور بچیوں کو شریک ہونے کا موقعہ ملتا تھا۔ اس زمانے میں کشمیر میں سال میں ایک مرتبہ ہر تحصیل

صدر مقام پر ’’جشنِ کشمیر‘‘ نام سے ایک فیسٹیول منایا جاتا تھا۔ جس میں مقامی فنکار، موسیقار، رقاص اپنے قومی لوک ورثے کو پیش کرتے تھے۔ ثقافتی پروگرام ہوتے تھے۔ قوالیوں کی محفلیں منعقد ہوتی تھی۔ مشاعرے ہوتے تھے جن میں مقامی کلاکاروں کے علاوہ ریاست کے باہر سے قوال اور شاعر مدعو ہوتے تھے۔ ان سب کھیل تماشوں، تمدنی اور ادبی پروگراموں سے ہم جیسے لڑکوں کے اندر بھی ایک تحریک سی پیدا ہوتی۔ دھیرے دھیرے دلچسپی شوق میں بدلتی گئی اور پھر شوق بھرپور شمولیت میں بدل گیا۔ میری آواز سُننے والوں کو پسند آنے لگی۔ اس لئے مجھے گانا اور بعض اوقات رقص بھی کرنا پڑا۔ گانے پر سب سے پہلے جو انعام مجھے ملا تھا اُس کی مالیت 5 روپے تھی اور یہ انعام مجھے اُس وقت کے مرکزی پلاننگ سیکریٹری......ڈاکٹر سید عابد حسین کے ہاتھوں سے ملا تھا اور اس تقریب میں اس وقت کے ریاستی وزیر جنگلات مرحوم غلام نبی سوگامی اور ڈپٹی کمشنر بارہمولہ شیخ غلام احمد کے علاوہ ایم ایل اوڑی راجہ محمد افضل خان بھی تھے۔ جموں و کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد جب بھی اوڑی تشریف لاتے تو بونیار میں ضرور رکتے۔ جہاں مجھے اُن کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح سے بخشی صاحب سے شناسائی پڑھتی گئی اور بعد میں وہ مجھے میرے نام سے پُکارتے تھے۔ ہائی سکول سے فارغ ہو کر میرا اگلا پڑاؤ کالج تھا لیکن میں کالج کی تعلیم ریگولر طالب علم کی حیثیت سے مکمل نہ کر سکا بلکہ مجھے نوکری مل گئی۔ میں ٹیچر بن گیا اور خود طالب علمی کی زندگی ترک کر کے تدریسی عمل شروع کر دیا۔ سرکاری نوکری شروع ہوتے ہی جہاں ثقافتی پروگراموں میں میری شرکت لگ بھگ ختم ہی ہو گئی لیکن مطالعہ جاری رہا......اور دوران ملازمت ہی میں نے ایم اے کر لیا۔ پھر بی ایڈ بھی پاس کیا۔ لیکن اسی درمیان مجھے لکھنے پڑھنے کا موقعہ میسر رہا اور 1964ء میں میرا پہلا مضمون ...... ’’بندہ مزدور کو جا کر میرا پیغام دے‘‘ جموں کے ایک اُردو ہفت روزے ’’زادِ راہ‘‘ میں شائع

ہوا۔ یہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا آفرفیشل آرگن تھا۔ دوسرا مضمون ''وادی ہاپت کھائی کی سیر'' روزنامہ خدمت سرینگر میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ اُس کے بعد سی پی آئی کے ایک اور ہفتہ وار اخبار ''ہمارا کشمیر'' میں ایک مضمون زیرِ عنوان ''دانہ اور دہقاں'' عنوان سے شائع ہوا۔ میری باضابطہ ادبی زندگی کا آغاز میرے افسانہ ''کلائمکس'' سے ہوا جو اگست 1967ء میں برصغیر کے مشہور اور موقر جریدے ''بیسویں صدی'' دہلی میں شائع ہوا۔ اس کامیابی نے میری زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں فرش سے اچانک اُٹھ کر عرش کی بلندیوں کو چھونے لگا ہوں۔ اسی افسانے نے مجھے برصغیر کے ادبی حلقوں میں روشناس کیا۔ مجھے کینیا، ہندوستان اور پاکستان سے کئی خطوط موصول ہوئے جن میں سب سے پیارا خط ایک ایسے شخص کا تھا جس کا نام راہی بے وفا تھا اور وہ ایک فوجی آفیسر تھا۔ یہ سارے خطوط آج کی تاریخ تک میرے پاس موجود ہیں...... ''کلائمکس'' کے بعد بیسویں صدی میں میرے چھ افسانے شائع ہوئے۔ بیسویں صدی اُس وقت اُردو دنیا میں پڑھے جانے والا واحد ایسا جریدہ تھا جس میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، قاضی عبدالغفار، رام لال، قرۃ العین حیدر، آمنہ ابوالحسن، احمد ندیم قاسمی، حامدی کاشمیری، نور شاہ، طفیل ہوشیارپوری اور ہاجرہ مسرور، مہندر ناتھ، کوثر چاندپوری، دیویندر سیتارتھی، م م راجندر، ڈاکٹر بشیشر پردیپ، دھیرج کنول، بلونت سنگھ، ڈاکٹر برج پریمی، کلدیپ رعنا...... رتن سنگھ، کے کے نیر، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، کنھیا لال کپور، علی سردار جعفری، اعجاز صدیقی، فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، رشید صدیقی، سلمہ صدیقی، عابد مناوری، عندلیب شادانی، راجہ مہدی علی خان، سبزواری، قتیل شفائی، فکر تونسوی اور کئی صف اول کے ادیب اور شاعر شائع ہوتے تھے۔ بیسویں صدی کے علاوہ میری کہانیاں روبی، شمع، ہما، شبستان، باجی، شب خون، شاعر شاخسار، پروانہ، تراش، فلم ویکلی، رفتار، نگینہ، دیہات سدھار وغیرہ میں شائع

ہوئیں۔1969ء کے مارچ مہینے کی19/18 تاریخ کو میرا پہلا افسانہ ''دوسرا آدم'' ریڈیو کشمیر سرینگر کے اردو ادبی میگزین پروگرام ''خرمن'' میں نشر ہوا۔ایک دن پتہ نہیں مجھے کیا سوجھی کہ میں نے شاعری کرنے کی ٹھان لی۔ تخلص تو میرے پاس تھا ہی باقی مقطع سے مطلع تک غزل لکھنا ہی باقی تھا۔

چنانچہ میں نے پہلی ہی کوشش میں چار تاریخی اشعار (زعم خود) موزون کر لئے اور سرینگر میں مقیم دہلی کے ایک معروف شاعر ادیب کو جا کر دکھائے۔اس بندہ خدا نے میرے اس کاغذ کو کئی بار اُلٹ پلٹ کر دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر کہا...... ''یہ کیا ہے؟'' مجھے اس کے اس نا معقول قسم کے سوال پر غصہ بھی آیا لیکن میں نے اپنے غصے کو مصنوعی مسکراہٹ کے پیچھے چھپا دیا اور زہر کا گھونٹ پینے کے بعد کہا'' جناب یہ ایک کاغذ کا ورق ہے اور اس پر مرقوم اشعار میرے ہیں۔آپ سے داد اور تصیح کا طلب گار ہو......''

''اچھا......؟ تو اس کاغذ پر جو کچھ تحریر ہے آپ اس کی بات کر رہے ہیں؟...... ارے واہ...... بھئی واہ...... اگر یہ اشعار ہیں تو بھئی کیا کہنا' واہ واہ واہ...... ایسے اشعار اس حقیر نے نہ آج تک پڑھے ہیں نہ سُنے ہیں۔بھئی میرا خیال ہے کہ یہ شاعری ولی دکنی سے ایک سو سال پہلے گزرے ایک شاعر جس کا نام اُردو شاعری کے تذکرہ نگاروں کو بھی فی الوقت معلوم نہیں ہو سکا ہے سے بھی بہتر ہے......'' پھر ذرا توقف کے بعد گویا ہوئے'' برخوردار آئندہ اس شاعری وائیری کے چکر میں مت پڑو' تم نثر پر ہی طبع آزمائی جاری رکھو......'' میں بھاری قدموں سے وہاں سے اُٹھا اور سیدھا اپنے ایک اور لنگوٹیے کے پاس پہنچ اور اُسے اپنی درد بھری کہانی سُنائی...... یاد رہے کہ میں اُسے ایک بہت بڑا شاعر سمجھتا تھا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اس فیلڈ میں وہ بھی میری طرح کنگال اور نا اہل ہے۔دراصل اُسے اُردو کے نامور شعرا کے ہزاروں اشعار ازبر تھے اور وہ نجی محفلوں میں وہ اشعار سُنا سنا کر ہمیں

مرعوب کرتا اور اپنا دبدبہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ راز کھل جانے کے بعد وہ بھی عرش سے گر کر میری طرح فرش پر رینگنے لگا تھا۔ اُس نے حق دوستی نبھاتے ہوئے مجھے مشورہ دیا کہ میں یہ اشعار ایک اور غیر معروف شاعر اطہر کو دکھاؤں۔ اطہر بڑا سخن شناس آدمی لگا۔ اُس نے کچی پنسل سے میرے اشعار کی نوک پلک سنوارنے کے بعد وہ کاغذ مجھے واپس دیا اور کہنے لگا ......بھئی کمال ہے آپ تو کمال کے ترقی پسند شاعر ہیں۔" یہ اشعار مخدوم محی الدین اور سردار جعفری کے مزاج کی چیز ہیں۔ تم آج تک کہاں چھپے رہے......؟" مجھے اُس عظیم انسان کے تاثرات جان کر ایسا لگا کہ مارے خوشی کے میری حرکت قلب بند ہونے والی ہے۔ میں اُس کا شکریہ کرنا بھی بھول گیا اور پتہ نہیں کیسے اپنے مشیر خاص کے پاس پہنچا جس نے اُس کا پتہ بتا دیا تھا۔ میں نے اُسے چوم کر کہا "یار آخر میں تو شاعر بن ہی گیا۔ بن ہی گیا...... بن ہی گیا......" اُس نے وہ کاغذ مجھ سے لے کر پڑھ کر کہا/تم نے یہ تصحیح کے بعد پڑھا......؟ یہ کہہ کر اس نے وہ کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا...... میں نے اُس پر لکھی ہوئی تحریر" پڑھنے کی کوشش کی لیکن پایا کہ اُس کاغذ سے میرا کلام صاف غائب تھا...... دراصل اطہر نے میرے اشعار کی ایسی اُوڑہالنگ کی تھی کہ اُس کا پورا حلیہ ہی بدل ڈالا تھا۔ صرف کاغذ میرا تھا۔ اُس کے اوپر تحریر کسی اور کی تھی اس تحریر کا ہر لفظ میرے لئے ایک تازیانہ عبرت تھا...... میں نے اُسی دن یہ گناہ پھر دوبارہ نہ کرنے کی قسم کھالی اور وہ دن اور یہ دن۔ پھر کبھی "چاک گریبان" جنونیوں کے اس محلے میں قدم رنجہ نہ فرمایا...... اپنے لئے سخنور کے بجائے سخن شناس کہلوانا ہی مناسب سمجھا۔ کچھ دن تک کاغذ اور قلم کو چھوا تک نہیں لیکن پھر ذہن میں ارتعاش سا پیدا ہونے لگا۔ طبیعت پھر مچل اٹھی ڈرتے ڈرتے قلم پھر اٹھایا اور راستہ بدل کر اُس ڈگر پر چل پڑا۔ جس پر آج تک گامزن ہوں۔

کہتے ہیں کہ فن یا ہنر قدرت سے ودیعت ہوتا ہے۔ انسان کی ذہانت اور صلاحیت

کا اس عمل میں دخل برائے نام ہوتا ہے۔ لیکن میرا خیال اس ضمن میں یہ ہے کہ بغیر مطالعہ اور مشاہدہ کوئی فن پارہ شہ پارہ نہیں بن سکتا بلکہ اس کی تشبیہہ خوب صورت کاغذی پھول سے دی جاسکتی ہے۔ کاغذی پھول بنانے والے کے جمالیاتی شعور اور حسن کی تعریف بھی کی جاسکتی ہے لیکن فطرت نے جس لالے کی اپنے ہاتھوں سے حنا بندی کی ہو اُس کی جمالیات کا کیا کہنا۔ آسمان کی طرف دیکھے بغیر کوئی اُس کا رنگ نہیں بتا سکتا۔ شکر یا نمک کو دیکھے بغیر کوئی اُسکا ذائقہ نہیں بتا سکتا۔ اسلئے میرا نظریہ یہ ہے کہ ادیب ہو یا شاعر اُس کے لئے مطالعہ اور مشاہدہ بے حد ضروری ہے۔

1970ء میں مجھے میرے ایک محسن نے سرینگر کے ایک اردو روزنامے "چنار" کا ایڈیٹر بنوا دیا۔ کیونکہ اُس کا ایڈیٹر...... پبلشر اور پرنٹر جھگڑا کر کے ناراض ہو کر بھاگ گیا تھا۔ میں نے یہ چیلنج قبول کر لیا حالانکہ میں صحافت کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا لیکن میں نے دل ہی دل میں ایک غلط بات کہہ ڈالی "کہ یہ کشمیر ہے...... یہاں چلے گا......!" مجھے کچھ معلوم نہیں کہ ایک سال تک اس اخبار کو میں کیسے چلاتا رہا۔؟ سب ہم عصر بشمول نامور صحافی اور دانشور شمیم احمد شمیم نے میری تعریف کی ...... بالآخر واپس جانا پڑا۔ اسی دوران میرا پہلا افسانوی مجموعہ "دوسرا آدم" جو لیتھو سے شائع ہوا اس میں میں بیس افسانے تھے اور اسکا پیش لفظ ڈاکٹر کمال صدیقی نے لکھا تھا اور جواہر نگر کے لیڈیز انفارمیشن سینٹر میں ڈاکٹر شکیل الرحمان صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے ہاتھ سے ریلیز ہوا جب ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چل رہی تھی اور کچھ دن کے بعد سابق مشرقی پاکستان میں جنرل نیازی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس مجلس میں کچھ قومی اخباروں کے نمائندے بھی موجود تھے۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں ایک قرارداد پیش کروں جس میں حکومت ہند پر زور دیا گیا ہو کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کیا جائے۔ میں نے قرارداد پیش کی اور اسے بہ اتفاق رائے منظور کر لیا گیا۔ دراصل

مجھے اور ڈاکٹر شکیل الرحمان کو چھوڑ کر اس مجلس میں جتنے بھی لوگ تھے وہ سب سیاسی جماعتوں سے وابستہ تھے۔ اگلے روز مرحوم شمیم احمد شمیم نے جموں سے فون پر مجھے بہت ڈانٹا اور کہا کہ ''تمہیں بعض مفاد خصوصی رکھنے والے عناصر استعمال کر رہے ہیں''۔ دوسرا آدم کی دو جلدوں 28 نومبر 1998ء تک میری لائبیریری میں موجود تھیں۔ جو ایک پراسرار آگ میں دوسری تین ہزار کتب کے ساتھ ردی کے ڈھیر میں بدل گئیں۔

''دوسرا آدم'' اور یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں......؟ ان کتابوں کا مصنف نذر بونیاری ہے۔ جو عبدالقیوم خان سے 12/10 سال چھوٹا ہے۔ جس دن عبدالقیوم خان چوٹھے پر دینی رکھ کر الف لیلیٰ پڑھ رہا تھا اُس دن تو ابھی نذر بونیاری پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ سطور میں عرض کیا کہ میری تحریر جب میری رف کاپی سے منتقل ہو کر اخبار کے صفحے پر بکھر گئی تو مجھے خیال آیا کہ میں اپنے ذات اور شخصیت کو ذرا Abnormal بنا لوں۔ چنانچہ ابتدائی ایام میں عبدالقیوم خان کے آگے نجاز کا لاحقہ لگا دیا پھر دوستوں نے کہا کہ تخلص کچھ اور رکھ لو...... چنانچہ مجاز کو ہٹا کر مفرو کر لیا یہ بھی نہ جچا تو ساگر رکھ لیا۔ جب بیسویں صدی میں کلائمکس چھپا تو ایک دوست نے خط میں لکھا' یار تمہارا نام تو بڑا مختصر ہے' اسے ذرا اور مختصر کر لو تو بہتر ہے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس کے کہنے کا مطلب کچھ اور ہے کیونکہ میں نے اس افسانے کے اوپر راجہ عبدالقیوم خان نذر بونیاری لکھ دیا تھا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ''راجہ'' لفظ ہٹا دو کیونکہ میری تحریر سے مترشح تھا کہ میں ترقی پسند ادیب بن رہا ہوں۔ جہاں راجوں مہاراجوں' شاہوں اور بادشاہوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ صرف مزدور' کسان اور محنت کش مظلوم ومحکوم اور طبقے کی ترجمانی کرنا پڑتی ہے۔ ابتدائی تحریروں میں اشتراکی نظریات جھلکتے نظر آئیں گے۔ لیکن رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا کہ ادب میں کسی ایک مخصوص نظریے کے ساتھ وابستگی اختیار کرنے سے ادب اور

ادیب دونوں Water Tight Compartments میں بٹ جاتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے سماج میں گوناگوں مسائل موجود ہیں۔ کہانیاں لکھنے کے لئے ہمیں پلاٹ اپنے آس پاس گاؤں کے کھیت کھلیانوں، باغوں، ندی نالوں، جونپڑیوں اور تالابوں، گلی کوچوں اور شہر کے فٹ پاتھوں سے لے کر سرکاری دفاتر کی اونچی اونچی عمارتوں اور جھگی جھونپڑیوں اور تعلیمی اداروں میں وافر تعداد میں دستیاب ہیں۔ بعض مقامات پر ہم خود چونکا دینے والی دلچسپ کہانیوں کے کردار معلوم ہوتے ہیں۔ ہم سوسائٹی کے جس فرد سے بھی واقف ہیں خواہ وہ ہمارے گھر کے اندر ہو یا باہر وہ ہماری کہانیوں کا کردار ہے۔ ہوسکتا ہے۔ لگتا ہے کہ مظلوم ومحکوم غریب ولاچار، بھوکے ننگے، بیمار اور مسکین، محنت کش اور کسان میرے اردگرد کے ماحول کا ایک حصہ تھے اور جب دیو مالائی داستانوں کے اندر کے کرداروں کو جو مُردوں کو کھاتے تھے۔ اُن داستانوں اور قبروں سے باہر زندہ دیکھا تو...... میں سمجھ گیا کہ میں تو خود ایسے ہی مافوق الفطرت کرداروں کے بیچ رہ رہا ہوں۔ میکسم گورکی، تورگینٹ، لیوٹالسٹائی، پشکن اور گوگول کی چیزیں پڑھتے پڑھتے میں نے رُوسی اشتراکیت کو اپنا ادبی دبستان بنالیا اور کئی سالوں تک اسی سکول سے وابستہ رہا اور پھر رفتہ رفتہ اپنے آپ کو نظریاتی غلامی سے آزاد کرلیا اور آج میں کسی ادبی دبستان فکر کا نہ حامی ہوں نہ شاگرد، میں اس وقت سماج کی ایک کمزور سی اکائی ہوں۔ چونکہ سٹھیا گیا ہوں اس لئے عمر نام اور جسم کے اعتبار سے قابل لحاظ حد تک سمٹ کر رہ گیا ہوں۔ میرا اصلی نام آج میرے گھر والے بھی نہیں جانتے نہ محلے اور گاؤں والوں کو معلوم ہے...... سب مجھے نذر بونیاری کہتے ہیں۔

زیر نظر افسانوی مجموعے میں ایک انشائیہ بھی شامل ہے جس کا عنوان ہے "چھینک"...... میری خواہش ہے کہ یہ کتاب جس کے ہاتھ لگے وہ اسے ضرور پڑھے۔ میری کامیابی اور پذیرائی کا انحصار صرف ایک ہی بات پر ہے کہ اس کتاب کو کتنے قارئین

نے پڑھا۔ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

جو قارئین مجھ سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہوں۔ وہ ان نمبرات پر فون کر سکتے ہیں یا براہ راست خط لکھ کر مجھے میری خامیوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔

WLL:01956-210600

CELL: 9419540803

تشنۂ التفات

نذر بونیاری

ترکانجن بارہمولہ کشمیر193122

مورخہ20/اپریل2008ء

تھیسس

سہ پہر کو انڈیا کافی ہاؤس کے کچھ کیبن خالی تھے۔ مین ہال میں کوئی درجن بھر بے فکرے ""مفکر"" معمول کے مطابق گوناگوں عالمی مسائل پر بحث میں مصروف تھے۔ یوں بھی ہر ماہ کے آخری عشرے میں کافی ہاؤس کے مستقل گاہکوں کی حاضری میں فرق آجاتا ہے۔ لو پیڈ سرکاری ملازم تو آٹھ دس تاریخ سے ہی اس ہاؤس کی نشستوں سے محروم ہو جاتے ہیں لیکن کچھ "باعزت" ایل ڈی سی بہر حال دن میں اگر دو مرتبہ نہ سہی دفتر بند ہو جانے کے بعد براستہ کافی ہاؤس ہی گھر جاتے ہیں اور رہتے رہتے صرف انجینئر' صنعت کار' خفیہ پولیس کے سفید پوش' ڈاکٹر' کچھ پروفیسر' "سیاستدان"' صحافی اور چیمبر آف کامرس کے ارکان یا پھر بعض بیوپاری حضرات کافی ہاؤس کی کرسیوں کی زینت بنے رہتے ہیں اور ہر ماہ کے اوئل ایام میں ہر شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی مخلوق اس چھوٹے سے ہاؤس میں کافی پینے آتی ہے۔ جس طرح سے محلے کی مسجد میں ہر صبح وشام مخصوص قسم کے جانے پہچانے چہرے نظر آتے ہیں جو مسجد سے باہر محمود وایاز ہی کیوں نہ ہوں لیکن مسجد کے اندر صرف نمازی کہلاتے ہیں۔ اس طرح سے کافی ہاؤس میں بیٹھی ہوئی مخلوق بزعم خود دانشور' روشن ضمیر اور ترقی پسند کہلاتی ہے۔ حالانکہ "ہاؤس" سے باہر ہر ایک کی اپنی اپنی دنیا

ہوتی ہے۔ یہ حضرات جس طرح باہر اپنے اپنے واٹر ٹائٹ کمپارٹمنٹوں میں منقسم ہوتے ہیں اسی طرح کافی ہاؤس کے اندر اپنی اپنی مخصوص نشستوں کو کبھی نہیں چھوڑتے۔ مشرقی گوشے میں بچھی ہوئی میز کے گرد بیٹھنے والے کبھی مغربی کونے میں نہیں بیٹھتے۔ چنانچہ ہاؤس کے درودیواروں پر آویزاں پینٹنگس، ایش ٹرے، ایگزاسٹ فینس اور کپ و پرچیں بھی اُن سے مانوس ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ویٹر آنکھیں بند کر کے "سروس" کرتے ہیں کیونکہ انہیں کسی سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ "حضور کیا لائیں؟" ہر میز کے گرد بیٹھے ہوئے دانشوروں کا آرڈر کیا ہوگا وہ بخوبی جانتے ہیں۔

مثلاً ٹیبل نمبر 7 پر بیٹھے ہوئے حضرات نان ویجی ٹیرین ہیں اور وہ سیخ کباب اور بھنا ہوا گوشت ہی لیتے ہیں۔ ان میں دو انجینئر، ایک صنعت کار اور ٹریڈ یونین لیڈر ہے۔ جس کی جیب میں کبھی ایک کوڑی نہیں ہوتی لیکن اُس کی نظر صنعت کار کے پھولے ہوئے پرس پر ہمیشہ رہتی ہے۔

ٹیبل نمبر 10 پر دو صحافی، ایک وکیل اور ایک پروفیسر بیٹھے ہیں یہ حضرات آملیٹ ہی لیتے ہیں۔ ویٹر کو ان سے آرڈر لینے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ ٹیبل نمبر 12 پر ایک ہفت روزے کے ایڈیٹر، ایک سال خوردہ پروفیسر، مقامی ریڈیو کے ایک پروڈیوسر اور ایک شاعر کا ہے۔ یہ صرف کافی پیتے ہیں۔ کبھی کبھی آلو کے چپس منگوا لیتے ہیں۔ کاونٹر کے بغل میں جو ٹیبل ہے اس پر کچھ طالب علم اور بے روزگار انجینئروں کا ایک لیڈر روزانہ آکر یا تو مفت کافی پی جاتے ہیں یا پھر صرف سگریٹ پی کر اور اخبار پڑھ کر چلے جاتے ہیں۔

آج چند ایک ٹیبل خالی تھے...... ہال کے اندر کئی برانڈ کے سگریٹوں کا دھواں بادلوں کی طرح ادھر اُدھر منڈلا رہا تھا اور ان بادلوں میں دور سے صرف چند فارغ البال چمکتی چاندیں نظر آ رہی تھیں۔ آج کچھ نئے مہمان بھی آ گئے تھے کیونکہ وہ بالکل اجنبی تھے اور کافی

ہاؤس کے کلچر، روایات اور آداب سے نا آشنا تھے۔

پروفیسر دُرانی سگریٹ کے مرغولے چھت کی طرف دھکیلتے ہوئے سلمان صاحب جرنلسٹ کو ماحول کی آلودگی کی وجہ سے اوزون لیئر (Ozone Layer) میں شگاف پڑجانے کے مضمرات پر درس دے رہے تھے۔ دوسری میز پر ایک ہفت روزہ کے مدیر جناب مدہوش صاحب اپنے ہم میز جناب فوجا سنگھ سے مخاطب تھے۔

''آج کل پورا ملک گوٹالوں کی گڑ بڑ میں ملوث ہو چکا ہے۔ سی بی آئی نے کچھ اور سابق وزیروں کیخلاف چارج شیٹ اشو کی ہے اور عنقریب سنسنی خیز انکشافات متوقع ہیں''۔

''کیا ہیں......؟ یار یہ کیسی اُردو بولتے ہو...... یہ ''افنشکانات'' کیا ہوتا ہے؟ سردار فوجا سنگھ باغی کی باغی طبیعت میں اُبال آ گیا۔

''ابے باغی تجھے کتنی بار سمجھا چکا ہوں کہ تو بیچ سے ٹوکا نہ کر......کمال ہے تجھے یہ بھی علم نہیں کہ انکشافات کسے کہتے ہیں؟

''قسے قہتے ہیں؟'' باغی نے آلو چپس چباتے ہوئے پوچھا

''انکشافات...... کہتے ہیں۔ کسے کہتے ہیں۔

یار مجھے اُس کا دوسرا اُردو لفظ معلوم نہیں۔ خیر چھوڑو۔ آخر اس ملک کا کیا ہوگا؟''

''ہوگا کیا......؟ بس ایک انقلاب آئے گا۔ سرخ انقلاب'' ایک گیسو دراز قسم کے دانشور نے آ کر خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ''اگر دنیا بھر کے سارے محنت کش، مزدور اور کسان ایک ہو جائیں تو اس ملک کو ایک اشتراکی ریاست بنا سکتے ہیں۔ پرولتاری نظام......''

''ابے اولال بجھکڑ بند کر اپنی بکواس'' باغی پھر بگڑ گیا...... بول کیا کھلائے گا؟''

''یار میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ جب تک نظام نہیں بدلے گا......''

تب تک تو کافی بھی نہیں پی سکے گا......آؤ چلیں......!''

غربی گوشے کی ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے چار اشخاص جن میں سے ایک انجینئر، ایک ٹھیکیدار، ایک صحافی اور ایک پولیس آفیسر بیٹھے ہوئے کبابوں پر چھری کانٹے چلا رہے تھے اور گزشتہ 3/2 گھنٹوں سے وہ تین مرتبہ کباب اور کانتی ہضم کر چکے تھے اور تین چار پیکٹ اعلیٰ برانڈ کے سگریٹ پی چکے تھے۔ اب ایش ٹرے میں بیٹس رگڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چاروں دوست خوش تھے شاید 15/1 مسالے پر اتفاق ہو گیا تھا اور صحافی نے کچھ لے دے کے مان لیا تھا کہ وہ فی الحال بلیک میلنگ نہیں کرے گا۔ پولیس آفیسر نے بھی اپنے بچے کے سر کی قسم کھا کر وعدہ کیا تھا کہ وہ بھی ''کچھ نہیں دیکھے گا'' جاتے جاتے ٹھیکیدار نے فرائی فش چار پلیٹس کا آرڈر دے کر پیکٹ میں بچا ہوا آخری سگریٹ سلگایا''۔

اُن کے بغل والی میز پر نیم دراز پروفیسر گنجو ایک سمندری مہم Voyage کی داستان انگریزی میں اس طرح بیان کر رہے تھے جیسے کہ وہ خود اس میں شامل رہے ہوں۔ حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ کبھی شنکر اچاریہ کی پہاڑی پر بھی نہ چڑھے تھے اور نہ کبھی ڈل کی سیر شکارے میں بیٹھ کر کی تھی۔ وہ شنکر آچاریہ اور کرالہ سنگری کو بھی مونٹ ایورسٹ کی بڑی بہنیں اور ڈل کو ہند مہاساگر کی چھوٹی بہن سمجھتے تھے۔ اُن کے آگے ایک پلیٹ میں بھنے ہوئے چنوں کے دو چار دانے اور خالی کپ تھے۔

ریڈیو پر میڈم بیگم اختر کی آواز میں شکیل بدایونی کی غزل بجائی جا رہی تھی ''اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا......'' دھیمی دھیمی مدھم مدھم آواز کانوں کو بھلی لگ رہی تھی ......کافی ہاؤس کا منیجر کاونٹر پر کچھ اس طرح اکڑوں بیٹھا تھا جیسے کہ وہ کافی ہاؤس کا نہیں بلکہ ''وہائٹ ہاؤس'' کا منیجر ہو۔

اتنے میں آج ہی وارد ہونے والے مہمانوں میں سے دو شخص کھڑے ہو گئے۔ ایک بولا ''جنٹلمین...... میں آپ لوگوں کو ایک سرپرائز (Surprise) دینا چاہتا ہوں......'' کیا

آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟

ہاؤس میں موجود سبھوں کی نظریں ایک خوبرو نوجوان کی طرف اُٹھیں اور کئی لوگوں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ پروفیسر جاوید......!

''مبارک ہو...... مبارک ہو...'' کئی لوگ ہال کے بیچ کھڑے پروفیسر جاوید کی طرف بڑھے۔

''یار تم کب آئے......اب کیسے ہو؟......؟؟''

جاوید پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں......اور آج ہی مینٹل ہسپتال سے آیا ہوں......!''

''میں آپ سب کو ایک ایسی بات بتانا چاہتا ہوں جسے آپ سن کر حیرت بھی ہوگی اور افسوس بھی......؟

''کیا......؟ جلدی بولو......! پروفیسر رازدان نے پوچھا۔

''دراصل میں کبھی پاگل ہی نہیں ہوا تھا......؟ یہ سب ایک ڈرامہ تھا جو میں نے اپنے علم نفسیات میں اضافے کیلئے کھیلا تھا!'' دوستو تم جانتے ہو کہ میں نفسیات کا پروفیسر ہوں۔ نفسیات کے مضمون میں، میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا تھا جس کیلئے مجھے ایک ایسا Topic دیا گیا تھا جس میں انسانی نفسیات کے کچھ پوشیدہ پہلوؤں پر تحقیق کرنا مطلوب تھا جو میں پاگل خانے سے باہر رہ کر کبھی نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے یہ ڈرامہ کھیلا جس میں آپ ہی نہیں بلکہ میرے گھر والے بھی یہ سمجھ بیٹھے کہ میں اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہوں۔ دراصل میں سکول اور کالج میں ہمیشہ ڈراموں میں مختلف کردار نبھاتا تھا۔ مینٹل ہسپتال کے ڈاکٹر بھی دھوکہ کھا گئے میں نے وہاں جا کر ایسی ایسی حرکتیں کیں کہ وہ مجھے ایک نئے قسم کا مینٹل کیس سمجھ بیٹھے۔

''لیکن تم تو دوااور انجکشن بھی لیتے رہے ہو۔ کیاان سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی؟''

''ہوتی تھی ......!اس سے بھی مجھے تجربے ہوئے پہلے پہلے میں گولیاں کھالیتا تھا جن سے مجھے بہت نیند آتی تھی بعد میں ڈاکٹر سے گولیاں لے کر پھینک دیتا تھالیکن انجکشن سے نہیں بچ سکتا تھا میں کمرے کے اندر ہی پیشاب پھیرتا تھا اور اس کے اوپر سو جاتا تھا......''

''کئی لوگوں نے یہ سن کر ناک پر ہاتھ رکھا اور عجیب نظروں سے جاوید کی طرف دیکھنے لگے......''

''اور تم وہاں سب برداشت کرتے رہے......؟''

''ہاں ......!''اور جب مجھے اپنے سب سوالوں کے جواب مل گئے تو میں نے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اسے کہا کہ میں اب ٹھیک ہوگیا ہوں مجھے گھر جانے کی اجازت دی جائے''۔

''کمال ہے......!''اچھا جاوید یہ بتاؤ کہ تمہیں مینٹل ہسپتال کے اندر اور باہر کے ماحول میں کیا فرق نظر آیا؟''ایک صحافی نے پوچھا۔

''بہت بڑا فرق......!''

وہ کیا......!

''پاگل تو مینٹل ہسپتال کے باہر ہیں ...... یہاں اس کافی ہاؤس میں ......تم اور وہ مونچھوں والا منیجر سب پاگل ہو......مینٹل ہاسپٹل میں جتنے پاگل ہیں انہیں باہر کی دنیا کے لوگ پاگل نظر آتے ہیں جیسے کہ اگر ایک آدمی سر کے بل کھڑا ہو جائے تو اسے باقی سب لوگ ایسے لگیں گے جیسے کہ سبوں کی ٹانگیں اور پاؤں اوپر اور سر نیچے ہو۔

"یہ تو پاگل جیسی باتیں کرتا ہے......!" ڈاکٹر شفیع نے کہا۔

اس بات پر پروفیسر جاوید نے زوردار قہقہہ سے ہال میں موجود لوگوں کو خوفزدہ کر دیا۔

"میں تمہیں گرفتار کر سکتا ہوں۔ تم نے سرکار اور لوگوں کو دھوکا دیا ہے!" پولیس آفیسر بولا۔

"بے شک تم مجھے گرفتار کر لو اور مجھے جیل میں بند کر دو۔ دراصل میں ایک اور تھیس لکھنا چاہتا ہوں۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند قیدیوں کی نفسیات' اُن کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک اور پولیس کا رول۔

مجھے جلد گرفتار کر لو......" یہ سن کر سب ہکا بکا جاوید کی طرف دیکھنے لگے......
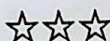
نمک کی قیمت

خبروں میں ایک سرخی چونکا دینے والی تھی کہ ایک ''بیٹے'' نے اپنی سگی ''ماں'' کی ناک کاٹ ڈالی۔ جب ہم چھوٹے تھے تو بڑوں سے اکثر کسی ''سلطانا ڈاکو'' کا ذکر سنتے تھے جس نے پھانسی کے تختے پر چڑھ کر آخری خواہش پوچھے جانے پر کہا تھا کہ وہ اپنی ''ماں'' سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ بقول ''راویاں'' جب اُسے ایسا کرنے کی جیل حکام سے اجازت مل گئی تو اس نے ماں کے کان میں سرگوشی کرنے کے بہانے اس کا کان کاٹ کھایا اور جب اس سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا ''میرے ڈاکو اور قاتل بننے کے پیچھے میری ماں کا ہاتھ ہے کیونکہ جب میں بچپن میں چھوٹی چھوٹی چوریاں کرتا تھا تو میری ماں مجھے ''شاباشی'' دیتی تھی، اس نے مجھے کبھی برائی کرنے سے نہ روکا اور نہ کبھی نصیحت کی''...... خدا جانے یہ کہانی محض ایک ''من گھڑت افسانہ'' ہے یا اس میں کوئی سچائی بھی ہے لیکن ناک کاٹ ڈالنے والی خبر کی تصدیق پولیس ذرائع سے بھی ہوگئی اور ہمیں ایک لمحہ فکریہ دے گئی کہ کیا کوئی ایسا بیٹا بھی ہوسکتا ہے جو ایسی گھناونی اور شرمناک حرکت کا مرتکب ہو۔ ایسے آدمی کے لئے لفظ ''بیٹا'' مناسب ہی نہیں لگتا۔ بہرحال ہماری سراغرساں طبیعت بلکہ جبلت یا پھر خصلت ہی کہیے'' نے اس راز کی تہہ میں جانے اور اس کی وجہ جاننے کی ٹھانی اور ہم نے ایجنٹ 007 بن کر اس کیس کی فائل سٹیڈی کرنے کی غرض سے اسے ''تھانے'' کے ریکارڈ سے چرالیا کیونکہ ''تھانے دار'' صاحب بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر اس کیس کے

حوالے سے ایک بھی بات کہنے کے موڈ میں نہ تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ''بیٹے'' کو اس نے ''لاک اپ'' میں محض رسم پوری کرنے کے لئے رکھا تھا اور رات کو ڈنر پر دونوں ایک ہی دسترخوان پر مرغی کی ٹانگیں اور سینہ نوچتے اور پھر ''بیٹا'' تھانے دار صاحب کے پہلو میں ہی لیٹ جاتا اور دوسری صبح ناشتے کے بعد پھر لاک اپ (روم) میں نظر آتا۔ کئی دن تک ''بیٹا'' تھانے والوں کے ٹکڑے توڑتا رہا' جب اس کی ''ایڈوانس'' کی بیلنس نل ہو گئی تو تھانیدار صاحب نے حوالدار کو بلا کر کہا ''اس کو صبح جانے دیا کرو اور ہدایت کی جائے کہ یہ شام تک واپس آ جائے بشرطیکہ دن بھر جو کچھ یہ ''کمائے'' اس کا 80 فیصد ہماری میز پر ڈھیر کرے ......لیکن ایک کانسٹیبل کو اس کے ساتھ سائے کی طرح رکھا جائے جو یہ دیکھے کہ اس نے کس کی جیب سے کتنے مارے؟ اور یہ تجربہ بھی کیا گیا۔ آخر کار ایک سیاسی پارٹی کے سرکردہ ''رہنما'' اور ایک ''وکیل'' صاحب نے اس کی ضمانت کروادی۔ بیٹا پھر گھر آ گیا۔ ''ماں'' نے اسے چھاتی سے لگا کر کہا کہ ''بیٹے تم میری جان ہو' جان جسمانی اعضاء کے مقابلے میں زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ ناک نہ رہی تو کوئی بات نہیں میری ناک تو میرا بیٹا ہے' میری آنکھیں بھی تم ہو' کہیں تم ناراض تو نہیں ہو گئے؟''

بیٹا کچھ نہ بولا......اُس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ نہ اعتراف جرم کر رہا ہے نہ اسے اپنی غلطی پر افسوس ہے بلکہ وہ مستقبل کے لئے اپنے ذہن میں ایسے منصوبے ترتیب دے رہا ہے جس کی مدد سے وہ اپنی ''ماں'' کو مزید دکھ اور تکلیف پہنچا سکے۔ ناک کٹ جانے کے بعد اب ''ماں'' کے پاس کیا تھا جو اسے دیتی یا وہ اس سے لیتا۔ پھر بھی اس نے ماں جیسی عظیم ہستی کی ''بے عزتی'' کرنے کی جیسے قسم کھا رکھی تھی' اُسے اس عظیم ہستی کے ''مقدس'' چہرے کو مسخ کرنے کا مذموم کام سونپا گیا تھا' جس کے عوض اُسے انعام واکرام سے بھی نوازا جاتا اور معاوضہ الگ سے ملتا۔ بیٹا گناہوں کی دلدل میں دھنس رہا تھا' اس کی عقل جواب

دے گئی تھی، ذہن ماؤف تھا، وہ بھولتا جا رہا تھا کہ وہ کون ہے، اس کو کس نے جنم دیا ہے، وہ کہاں جا رہا ہے، اُس کی سمت کہاں ہے، اُس کی منزل کیا ہے؟ صرف اس کی ماں جانتی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے فرزند ارجمند اس کے نور چشم اس کے لخت جگر نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ "ماں" کی ناک کاٹنے کے بعد اس کے ہاتھ بھی کاٹ ڈالے گا، اُس کے پیروں کو اس کے مقدس جسم سے الگ کر ڈالے گا، اس کی آنکھیں بھی پھوڑ ڈالے گا، پھر اس کے کان ......اور آخر کار اس کے جسم کو کئی ٹکڑے کر ڈالے گا اور انہیں ساگر میں پھینک دے گا اور خود سمندر کے کنارے آتی جاتی لہروں اور ڈوبتے سورج کو دیکھتا رہے گا اور پھر سمندر اس سے پوچھے گا......تم نے اپنی ماں کے جسم کے ٹکڑے کر ڈالے اور اسے میری گود میں سلا دیا...... کیوں؟......آخر کیوں؟......آخر کیوں؟......پھر سمندر سے ایک پیار بھری آواز آئے گی۔ میرے لخت جگر، میرے نور چشم ......تم نے میرے دودھ کی قیمت ادا نہیں کی اور اس سے پہلے ہی مجھے کھارے پانیوں کے حوالے کر دیا اور بیٹے کے ہونٹوں میں حرکت ہوگی۔

میں نے "نمک کی قیمت" ماں کی شکل میں ادا کی ہے۔ دودھ کی قیمت بعد کا معاملہ ......وہ میرے اور تمہارے درمیان ہے ماں......اور پھر اس کی آواز ڈوبتی جائے گی، اس کے ہونٹ منجمد ہو جائیں گے، زبان تالو سے چمٹ جائے گی، آنکھیں پتھرا جائیں گی اور وہ ایک مجسمے کی صورت میں ہزاروں سال تک ساحل پر "نصب" ہو کر رہ جائے گا، جہاں ہر برس "مائیں" اس مجسمے کو دودھ کے بجائے کھارے پانی سے نہلائیں گی، جہاں تک کہ یہ مجسمہ ریزہ ریزہ ہو کر لہروں کی نظر ہو جائے گا اور ساگر کی تہوں میں جا کر اپنی ماں کی گود میں سو جائے گا۔

سٹیٹ منٹ

اگر اسے معلوم ہوتا کہ اُس کا شوہر ایک بے حس، بے غیرت اور بے ایمان شخص ثابت ہوگا تو وہ ہرگز اس کی خاطر اپنے پڑوسی گل محمد سے جھگڑا مول لیکر مصیبت میں نہ پھنستی۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ اس کا شوہر احمد دین لین دین کے معاملے میں بددیانت واقع ہوا تھا اور ہر وقت لوگوں کی جھوٹی خوشامد کر کے اُن سے قرض مانگتا اور پھر برسوں تک ٹال مٹول کرنا اُس کی عادت بن چکی تھی۔ اُدھار دینے والوں نے اب اسے مزید قرض دینے کی قسم کھالی تھی۔ جس کے نتیجے میں احمد دین اب نئے نئے اور بے خبر چہروں کی تلاش میں رہنے لگا تھا۔ اس کی بیوی جگری بے حد محنتی اور جفاکش عورت تھی لیکن اُسے احمد دین کی ''اُدھار'' والی عادت پسند نہ تھی۔ اس نے کئی مرتبہ شوہر کو سمجھایا کہ وہ ''فضول قرضے'' نہ لے اور محنت مشقت کر کے کم کھاؤ غم نہ کھائے کے اصول پر چلتے ہوئے اپنی عزت اور وقار کا سودا ہر ایک سے نہ کرے۔ اس کی غیر حاضری میں قرض دار آتے اور ''جگری'' ان کی ''نگاہوں میں چھپی ہوئی نیت'' کو ٹھیک سمجھتی تھی لیکن کیا کرتی۔ زہر کا گھونٹ پی کر رہ جاتی اور قرضداروں کے پیغامات اپنے خاوند تک پہنچاتی۔ وہ اب دو بچوں کی ماں بھی ہوگئی تھی۔ ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں، اسے محنت کرنے کی عادت تھی، اس کا کسرتی بدن اس کیلئے بے حد مددگار ثابت ہو رہا تھا لیکن پھر بھی ایک احساس ندامت و محرومیت تھا جو اس کے ذہن اور شعور کو چبھ رہا تھا۔ وہ محلے کی دوسری ہم عمر عورتوں سے زیادہ کام کرتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ دوسروں

کے مقابلے میں غریب اور پچھڑی ہوئی لگتی تھی۔اس کی واحد پالتو گائے ایک قرض خواہ کھونٹی سے کھول کر لے گیا اور وہ دیکھتی رہ گئی۔اخروٹ کے سات درخت اُس گھر کی معیشت میں بے حد معاون ثابت ہو رہے تھے لیکن احمد دین نے اُن کا سودا بھی کسی سے طے کر ڈالا اور 10 سال کیلئے قرضے کے عوض ساہوکار کو فروخت کر دیئے۔آٹھ پیڑ ناشپاتی کے بھی قرضے کی بھینٹ چڑھ گئے۔بڑی مشکل سے جگری نے مرغیاں بیچ بیچ کر اور اُون کات کات کر ایک بیتل بکری خریدی۔لیکن ایک دن اس کا ہمسایہ گل محمد آدھمکا اور آتے ہی اس کے منہ سے جھاگ کے ساتھ ساتھ گالیوں کی جیسے جھڑی لگ گئی۔جگری خاموشی سے گل محمد کی بکواس سنتی رہی اور برداشت کرتی رہی۔اتفاق سے احمد دین بھی اس وقت گھر میں موجود تھا۔ گل محمد بکری کی طرف بڑھا "دیکھتا ہوں کہ مجھے اس بکری کو لے جانے سے کون روکتا ہے؟"۔"جگری کے کلیجے میں جیسے کسی نے خنجر گھونپ دیا ہو وہ تلملا اُٹھی۔اسے اپنی پالتو بکری جسے وہ پیار سے جانی کہتی تھی سے بے حد پیار تھا۔گل محمد بکری کو کھونٹی سے کھولنے لگا' بکری کی سمجھ میں بات آئی تھی وہ بار بار "ماں" پکار پکار کر جگری کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔جگری سے رہا نہ گیا وہ آگے بڑھی "یہ بکری میری ہے' میری ذاتی کمائی سے خریدی ہے۔تم اسے نہیں لے جا سکتے"۔

"ارے واہ ......کیوں نہیں لے جا سکتے۔میں نے بھی روپے دیئے ہیں۔نقد روپے ٹھیکریاں نہیں دی ہیں"۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن احمد دین وہ روپے اپنی کمائی سے چکا دے گا چاچا۔بس ایک ماہ اور صبر کرو......!"

"ہرگز نہیں ...... یہ چوتھا سال جا رہا ہے۔میں اب مزید صبر نہیں کر سکتا۔میں آج یہاں سے نہیں ہٹوں گا.....یا اپنے پیسے لے کر جاؤں گا.....یا اس بکری کو......!"

''دیکھو چاچا خدا کے واسطے اس بکری کو مت لے جایئے۔ کچھ اور لے جایئے۔ اس گھر میں جو چیز سوائے اس بکری کے آپ کو اچھی لگے تو لے جایئے......لیکن......''

''اچھا......تو سنو ...... مجھے تو اس گھر میں صرف تم ہی اچھی لگتی ہو...... چلو میرے ساتھ......!''

''چاچا......!'' جگری چلائی اور اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ گھوما اور ''گل محمد کی گال پر اتنے زور سے لگا کہ ''چٹا نیں کی آواز کے ساتھ ہی گل محمد کی فلک شگاف چیخ بھی فضا میں ابھری اور دوسرے ہی لمحے گل محمد احمد دین کے صحن میں دھول چاٹتا نظر آیا۔

''ارے یہ تم نے کیا کیا......؟ احمد دین نے آگے بڑھ کر جگری کو ٹوکا

''کیا کیا؟......ابے او بے غیرت خاوند تم نے نہیں سنا کہ اس حرام زادے نے کیا کہا......؟ ارے گالی دی تجھے گالی ...... بیوی کی گالی ...... میں تو اسے زندہ گھر نہیں جانے دوں گی۔ یہ کہہ کر اُس نے گل محمد کو ایک زوردار ٹھوکر ماری اور گل محمد جو پھر سے کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ بکری کی کھرلی میں منہ کے بل گرا اور مدد کیلئے اپنے بیٹوں کو بلانے لگا۔ اس نے اپنے سر پر کچھ گرم پانی سا گرتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے گھور کر دیکھا......''افوہ......یہ تو بکری...... میرے سر پر موت رہی ہے۔ احمد دین......سنو! میں اپنی اس سے زیادہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں چلا تھانے۔ مجھے نہ روکنا......اگر تجھے تیری اس کمینی بیوی کے سمیت گرفتار نہ کروایا تو میرا نام بھی......'' وہ گرتا پڑتا صحن کے دروازے سے باہر نکل گیا جگری نے احمد دین کی طرف غصے سے دیکھا......''ارے جاؤ کیا دیکھتا ہے۔ جاؤ کوئی بندوبست کرو اُسے دے دو کچھ جو اُدھار لے رکھا ہے!'' میں اپنی بکری کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی!''۔

پولیس والے آئے اور جگری کو اپنے ساتھ تھانے لے گئے۔ احمد دین بھی ان کے

ہمراہ تھا۔ جگری نے جاتے جاتے اپنی سہیلی اور پڑوسن فوزی سے کہہ دیا۔ میری بکری اور بچوں کا خیال رکھنا۔ فوزی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تمہاری بکری کو کچھ نہیں ہوگا تم اپنا خیال رکھنا''۔

تھانے پہنچ جانے کے فوراً بعد جگری نے محسوس کیا کہ پولیس والے کچھ کھسر پھسر کرر ہے ہیں اور شاید اُسی کے بارے میں ......اُس نے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا وہاں دو آدمی جو سول لباس میں تھے باتیں کرر ہے تھے ''اس عورت کو یہاں رکھنا مناسب نہ ہوگا۔ ''صاحب کو آنے دو۔ اُن سے مشورہ کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ اسے گھر ہی چھوڑ آئیں گے۔ حوالات میں اکیلی عورت......!''

اُن میں سے ایک جگری کے پاس آیا اور بولا......آپ کا گھر والا کہاں ہے؟......!''
''وہ تھوڑی دیر کے بعد آئے گا......'' ''کیا تم حوالات میں اکیلی رہ سکو گی یا......؟''
''مجھے کیا معلوم ......اگر میرا یہاں رہنا ضروری ہے تو ضرور رہوں گی لیکن بکری نہیں دوں گی!''

وہ بنچ پر بیٹھ گئی اور دانت سے ناخن چبانے لگی۔ اس آدمی نے اس کے لئے نمکین چائے کی ایک پیالی اور ایک تیل ورو لایا'' کھاؤ......! دیکھو اگر صاحب نے پوچھا کہ گھر جاؤ گی تو کہنا ہاں۔ کل پھر حاضر ہو جاؤں گی......!''

صاحب آ گئے ...... جونہی انہوں نے کمرے میں قدم رکھا تو اسی شخص سے پوچھا ......''منشی کہاں ہے؟ اس عورت کو لائے تھے کہ نہیں......اشرف کہاں ہے؟ اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے

''جناب منشی صاحب نماز پڑھ رہے ہیں۔ جگری کو لے آئے ہیں اندر بیٹھی ہے...... اشرف قادر کو لانے گیا ہے......''

تھانے دار صاحب نے دوسرے کمرے میں جھانک کر جونہی دیکھا......اُسے جیسے سکتہ سا ہو گیا...... "یہ......یہ......کون ہے شفیع ......؟" اس نے اس سول ڈریس والے پولیس والے سے پوچھا" جناب یہی جگری بہن ہے......!"

"جگری......؟ اچھا" ارے اسے یہاں کیوں بٹھا رکھا ہے؟ اسے میرے کمرے میں لے جاؤ!"

"ٹھیک ہے جناب ......" شفیع نے جواب دیا......صاحب منشی کے کمرے میں گئے اور فون کرنے لگے......موقعہ پاتے ہی شفیع نے جگری سے کہا" کہنا جب تک نہ میرا خاوند آئے گا میں یہاں سے نہیں ہٹوں گی!"

"صاحب فون کرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلے گئے اور پھر چند منٹوں کے بعد انہوں نے شفیع کو بلایا......!"

"اس عورت کو رات بھر کہاں رکھو گئے؟"

"جناب! میرا خیال ہے اسے گھر بھیج دینا چاہیے!"

"ہم ......! صاحب سوچنے لگے......وہ پھر اُٹھے اور جگری کے پاس گئے" تم اتنی اچھی لڑکی ہو......پھر لڑائی جھگڑا کیوں کرتی ہے! تمہارے خلاف تو دفعہ 323 لگ چکا ہے اور تمہیں جیل بھی ہو سکتی ہے۔ تم نے ایک معزز شہری کو نہ صرف پیٹا ہے بلکہ اس کی بے عزتی بھی کی ہے!"

"جناب وہ آدمی بڑا بے ایمان اور جعلساز ہے وہ ساٹھ روپے میں میری بکری لے جانا چاہتا ہے"

"دیکھو جب تم لوگ اسے اس سے لی گئی اُدھار رقم واپس نہیں کرو گے تو وہ کچھ بھی لے سکتا ہے"

''تھانے دار صاحب اس نے مجھے گالی دی ہے۔ کہتا تھا کہ اگر بکری نہیں دو گی تو میں تمہیں اُٹھا کر لے جاؤں گا''

''اچھا......؟'' تھانے دار ہنسنے لگے پھر اُس نے اپنے آپ ہی سے کہا ''ارے تم تو چیز ہی ایسی ہو کہ ہر وہ شخص جو تجھے دیکھے گا تجھے چرانا چاہیے گا......!''......خیر......میں تمہارا سٹیٹ منٹ لینا چاہتا ہوں۔ شفیع جگری کو میرے کمرے میں لے جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں تم یا کوئی اور میرے روم میں نہیں آئے گا او کے؟''

''ٹھیک ہے سر......!''

''لیکن جب تک میرا سرتاج نہیں آئے گا میں اندر نہیں جاؤں گی......!''

''ارے جہنم میں جائے تمہارا سرتاج ......''نہیں آئے گا تو کیا ہم اپنی ''قانونی کاروائی نہیں کریں گے؟''

''میں کچھ نہیں جانتی......اُسے آنے دیجئے پھر دیکھیں گے!''

''دیکھو ادھر مُلزم کی مرضی نہیں چلتی۔ تم قیدی ہو......اور ہم جہاں چاہیں تمہیں رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ تمہیں حوالات میں اکیلا رکھیں۔ اس لئے تم اندر میرے کمرے میں چلو۔ گھبراؤ مت۔ تمہارا سٹیٹ منٹ لینا ضروری ہے۔...... یہ کہہ کر ''صاحب'' تیزی سے باہر نکل گئے۔

احمد دین آ گیا......تو جگری نے کہا ''آفیسر کہتا ہے کہ میں اس کے کمرے میں جاؤں......!''

''وہ کیوں؟ احمد دین نے پوچھا'' کہتے ہیں کہ وہ میرا سٹیٹ منٹ لینا چاہتے ہیں''

''کیا......لینا چاہتے ہیں؟''

''ارے وہی جو میں نے کہا......!''

''تو تم نے کیا کہا......!''

''میں نے صاف صاف بتا دیا کہ جب تک نہ میرا خصم نہیں آئے گا......
میں اس کے کمرے میں نہیں جاؤں گی اور نہ کچھ دوں گی......!'
اسی وقت شفیع نے کہا کہ صاحب اندر بلا رہے ہیں۔ سٹیٹ منٹ لینا ہے......!''
''جگری نے احمد دین کی طرف دیکھا'' جاؤ......میں باہر بیٹھا ہوں......!''
جگری صاحب کے کمرے میں چلی گئی اور کسی نے اندر سے دروازہ بند کر دیا۔
تھوڑی دیر کے بعد منشی بھی آ گیا وہ کچھ کاغذ اور ایک فائل لیکر اندر گیا اور پھر دروازہ بند کر دیا گیا۔ تقریباً 30 منٹ تک کمرے کے اندر سکوت چھایا رہا لیکن پھر اچانک شور سا ہوا اور پھر اگلے ہی لمحہ جگری دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے دوپٹہ غائب تھا اور فراک چھاتیوں کے اُوپر سے چاک تھا۔ اُس کا چہرہ غصہ سے لال ہو رہا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ وہ تھانے دار اور منشی کے نام ماں بہن کی گالیاں دے رہی تھی بلکہ اُن کی سات پیڑھیوں کی خبر لے رہی تھی۔ میں بڑے آفیسر کے پاس جا رہی ہوں......اس تھانے دار نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ بڑا آیا'' میرا اسٹیٹ منٹ لینے والا......کم بخت پاپی مر جائیں اس کے سب......ایک بے ایمان میری بکری لے جانا چاہتا تھا اور دوسرا اسٹیٹ منٹ......اتنے میں تھانے دار اور منشی دونوں باہر آ گئے تھے۔
''دیکھو جگری تم ایک چوری اوپر سے سینہ زوری کر رہی ہو تم ملزمہ ہو......شور مت کرو ہم تمہیں جیل بھجوا دیں گے جہاں ساری عمر تم کو چکی پیسنا پڑے گی!'' شفیع اس عورت کو لاک اپ میں بند کر دو......!'' لیکن شفیع وہاں موجود نہ تھا۔ مجبوراً منشی کو حوالات کا دروازہ کھولنا پڑا اور جگری کو اندر دھکیل دیا۔
''دیکھا تم نے......!'' جگری نے لاک اپ کے اندر سے احمد دین کی طرف

مخاطب ہو کر کہا۔

''یہ کتنے بدمعاش اور پاپی ہیں۔اب مجھے سمجھ آیا کہ سٹیٹ منٹ کسے کہتے ہیں؟''
دیکھو یہاں سے نہ ہٹنا...... یہ سُور کے بچے میرا سٹیٹ منٹ زبردستی لیں گے......
مجھے بچاؤ'' کسی طرح آج کی رات کٹ جانی چاہیے کل دیکھیں گے!''

''اب تو احمد دین کو بھی سمجھ میں آ گیا کہ سٹیٹ منٹ کسے کہتے ہیں'' اسی اثناء میں چار سپاہی اور بھی آ چکے تھے ایک نے احمد دین سے کہا'' جاؤ اپنی بیوی کے لئے کھانا لے آؤ......!اور دیکھو تمہیں یہاں رہنے کی ضرورت نہیں۔تمہارا نام FIR میں نہیں تم گھر جا سکتے ہو......!''

''لیکن میں نہیں جاؤں گا۔تم لوگ جگری کا سٹیٹ منٹ لے جاؤ گیئے......!''

''مگر وہ تو لینا ہی ہے۔آج نہ سہی تو کل جگری کو سٹیٹ منٹ دینا ہی پڑے گا......!''

احمد دین بوجھل قدموں سے باہر آیا۔تو سڑک پر اُسے شفیع ملا۔شفیع اسی تھانے کا کارخاص تھا اور ایک اچھا شخص تھا'' دیکھو۔میں بڑے صاحب کے پاس گیا تھا'' وہ سرگوشی میں بولا میں نے جگری کی طرف سے ایک درخواست لکھ کر بڑے صاحب کو دی ہے کہ وہ چھوٹے صاحب کے سامنے کوئی سٹیٹ منٹ بڑے صاحب کے آگے ریکارڈ کروانا چاہتی ہے۔بڑے صاحب کل 10 بجے تشریف لا رہے ہیں تم چاہو تو گھر جا سکتے ہو۔میں جگری کو کھانا کھلا دوں گا۔

اگلی صبح بڑے صاحب آ گئے۔اُن کے ساتھ درجن بھر آفیسر اور سپاہی تھے۔جگری کو لاک اپ سے نکالا گیا...... بڑے صاحب نے کچھ تنبیہی لہجے میں وہاں موجود آفیسروں سے خطاب کیا'' سر میں جگری کا سٹیٹ منٹ ریکارڈ کرنا چاہتا تھا لیکن اس عورت نے بلاوجہ شور مچایا اور مجھ پر گندے قسم کے الزامات لگائے......!''

''اس کی فائل لاؤ......'' بڑے صاحب نے تحکمنانہ لہجے میں کہا اور فائل اُن کی خدمت میں پیش کردی گئی۔ فائل کا کم سے کم 20 منٹ تک بغور مطالعہ کرنے کے بعد بڑے صاحب نے تھانے دار سے کہا...... ''تمہاری شکایت اس سے پہلے بھی آئی ہے۔کیا یہی طریقہ ہے سٹیٹ منٹ ریکارڈ کرنے کا......؟اس کیخلاف FIR کیوں درج کروایا گیا وہ معاملہ تواب اس معاملے کے نیچے دب گیا'' اب ہمیں دوسری فائل کھولنا پڑے گی......!''

''جگری...... مجھے تمہاری شکایت موصول ہوئی ہے اور ان لوگوں نے تمہارے ساتھ جو بدتمیزی کی ہے مجھے اس پر بہت افسوس ہے۔ دراصل ایسے ہی لوگوں نے ہماری فورس کو بدنام کردیا ہے۔تم گھبراؤ مت......تمہارے ساتھ پورا انصاف ہوگا......تم میرے ساتھ اندر آؤ میں تمہارا اسٹیٹ منٹ لینا چاہتا ہوں......''

دیواریں اور لکیریں

"......ٹک ......ٹک ۔ٹک ......ٹک۔

کڑاں۔کڑاں کڑاں۔ٹک ٹک......

"ہو۔ہُو......ہوُے ہوُے۔اشِ اشِ......شی شی۔شی شی......ہووے۔ہوُووے"

اوُنہہ...... پتہ نہیں کیا ہوگیا......اس مُرغی کو......صبح سے کڑاں کڑاں کررہی ہے ......رحمت جان نے تھوڑے فاصلے پر بیٹھی ہوئی اُلفت بیگم سے کہا......جو گیہوں کی گھاس سے چٹائی بُننے میں مصروف تھی۔

"دُہی مُوا......کوآ آیا ہوگا......اور کیا خدا جوانی مرگ کرے کمینے کو بڑا زبردست چور ہے......"اُلفت بیگم نے جواب دیا۔"

رحمت جان نے چرخا۔پوچھا۔اٹی ۔اون وہیں چھوڑی اور کوٹھے کے پچھواڑے کھٹے اناروں کی جھاڑیوں کی طرف بھاگی جہاں خودرو گھاس میں اس کی مُرغی اور 9 چوُزے کہیں دُبکے ہوئے چوں چوں کررہے تھے۔رحمت جان نے جونہی ایک لکڑی سے گھاس ادھراُدھر ہٹانے کی کوشش کی......تاکہ وہ مرغی اور اُس ایک ماہ کی عمر کے چوُزوں کی خبر لیتی ......گھاس سے ٹک ٹک ٹک کڑاں کی آواز سے وہ جیسے پھدک سی گئی۔

اُس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا......توبہ توبہ......اس مُرغی نے تو مجھے مارہی دیا تھا۔دیکھو میرا دل کیسے دھک دھک کررہا ہے......ایک چوزہ گنوا بیٹھی نالائق کہیں کی۔ہائے

ایسی ماؤں کو لے جائیں چور...... ''کک کک کڑاں کڑاں......'' مُرغی چلائے جا رہی تھی۔

''ارے میں ہوں ری......تم دوست اور دشمن کو بھی نہیں پہچان سکتی......'' رحمت جان نے مرغی کی طرف مخاطب ہو کر کہا......آؤ......ذرا تمہیں چوگ چگا دوں۔

''آہ۔آہ۔آہ......آہ......'' وہ مرغی اور چوزوں کو بلانے لگی لیکن وہ تو گھاس سے باہر آنے کا نام تک نہ لیتے تھے......صرف وقفے وقفے کے بعد کک کک کڑاں کر ڈالتی اور چوزے مرغی کے پروں میں سے سر نکال کر چوں چوں کرنے لگتے......ایسا تب ہوتا ہے جب اُنہیں کوئی خطرہ محسوس ہو یا کوئی دشمن نظر آئے۔رحمت جان نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی......اچانک اُس کی نظر املوک کے پیڑ کی طرف گئی جہاں ایک شاخ پر ایک کالا کوا بیٹھا ٹہنی سے چونچ صاف کر رہا تھا۔

''اچھا......تو یہ حضرت یہاں بیٹھے ہیں۔تجھے میں زندہ نہیں چھوڑوں گی کالے مشٹنڈے، تو میرے چوزوں کو دیکھ کر چونچ تیز کر رہا ہے۔دیکھ کم بخت کی چونچ سے رال بہ رہی ہے۔رحمت جان ایک کنکر اُٹھانے کیلئے جونہی جھکی......کوّا چپکے سے اُڑ گیا......رحمت جان نے پھر بھی کنکر اس پیڑ کی طرف دے مارا ''ہوُوے ہوئے اِش اِش......'' اور پھر واپس آ کر چرخہ کاتنے لگی۔

''کیا تھا؟'' اُلفت جان نے پوچھا......؟''

''ارے وہی کل مُوہا......کوّا......پتہ نہیں یہ ہمارے گھر ڈیرہ جما کر کیوں بیٹھا ہے۔خدا غارت کرے اس غنیم کو''۔

''یہ سب چوزے کھا جائے گا۔اس نے چوزوں کو دیکھ لیا ہے! میری مرغی اپنے بچوں کی رکھوالی شیرنی کی طرح کرتی ہے۔مجال ہے جو کوئی کوّا چیل یا نیولا کسی چوزے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے!''

''بہن' میں سمجھتی تھی' کے چوزے ہیں اور ان کی قدرتی رکھوالی ہوتی ہے لیکن زمانہ بدلنے سے وہ سب روایتیں اور کہاوتیں بھی بدل گئی ہیں......اب دیکھو نہ ایک چوزا دو دن پہلے لاپتہ ہو گیا اور یہ کوّا تو املوک کے پیڑ پر ڈیرا جمائے ہوئے ہے......!''

''چلو رہنے دو......دفع کرو۔ یہ بتاؤ کہ بھائی صاحب شہر سے لوٹے کہ نہیں......؟''

''ارے ابھی کہاں؟ اُن کی فکر الگ سے کھائی جا رہی ہے......؟''

''......لیکن وہ شہر گئے کیوں......اگر میں غلط نہیں تو گزشتہ ایک ماہ کے دوران وہ چار یا پانچ مرتبہ شہر گئے ہوں گے......''

''اور نہیں تو کیا......ارے وہ پاسپورٹ ویزے کے کاغذات ہی نہیں بن رہے۔ کبھی کوئی رکاوٹ کبھی کوئی اڑچن......اُدھر پار خالہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ جانا ضروری ہے۔ خیر دیکھیں گے......!''

......کک......کک......کک......کک کڑاں کڑاں ......''پھر مرغی کا رونا۔ دشمن پھر آ گیا۔ مرغی مدد کے لئے بلا رہی ہے۔

''......رحمت جان پھر اس طرف دوڑی......اُس نے دیکھا کہ ایک فربہ اندام کوّا مرغی کے ساتھ گتھم گتھا ہے......اور بار بار ایک چوزے پر جھپٹ رہا ہے لیکن مرغی لختِ جگر کی جان بچانے کے لئے کوے پر تابڑ توڑ حملے کر رہی ہے۔ رحمت جان نے ادھر اُدھر دیکھا اسے جب کچھ نہ ملا تو ایک مٹی کا ڈھیلا اُٹھا کر کوّے کی طرف اُچھالا۔ بدقسمتی سے ڈھیلا کوّے کے بجائے مرغی کو جا لگا۔ وہ درد سے کراہی......اسی موقعہ کا فائدہ اُٹھا کر کوّا چوزے کو چونچ میں دبوچ لینے میں کامیاب ہو گیا اور مشرق کی جانب جو پہاڑی ہے اس طرف اُڑ گیا۔ رحمت جان ہوُوے ہوُوے۔ اِشے اِشے ہائے ہائے کرتے ہوئے اسی طرف دوڑ پڑی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کنکر تھا جو اس نے پہاڑی سے نیچے ایک گھاٹی کی طرف

جاتے ہوئے کوّے کی طرف اچھال دیا لیکن شکاری اس کنکر کی پہنچ سے باہر ہو گیا تھا...... وہ نالہ پار کر گیا اور ایک درخت پر بیٹھ گیا۔ جہاں اُسے چوزے کی ننھی ننھی بوٹیاں تناول کرنا تھیں۔ رحمت جان کو کوّے پر بے حد غصہ آ رہا تھا اور وہ ننگے پاؤں اس نالے کی طرف دوڑے جارہی تھی۔ اُس کے منہ سے کوّے کی سات پیڑیوں اور اس کی ماں بہن کے نام گالیاں اور بددعائیں نکل رہی تھی۔ اُدھر کوّے نے اب اپنے شکار کو پنجوں میں جکڑ کر نوچنا شروع کر دیا تھا۔

رحمت جان غصے سے لال اور پسینہ سے شرابور ہانپتی ہوئی اس پیڑ کی طرف دوڑ رہی تھی کہ اچانک کسی نے زور سے "ٹھم" پکارا۔ وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچی اور ہانپتی ہوئی زمین پر بیٹھ گئی۔ وہ اب بول بھی نہیں سکتی تھی۔ البتہ اشارے سے سنتری کو کوّے کی طرف دیکھنے کو کہہ رہی تھی۔

"تم کون ہو اور کہاں جارہی ہو؟" سنتری نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

رحمت جان نے سانسیں ہموار کیں اور "رُک رُک کر کہنے لگی ...... "وہ...... کوا...... میری...... مم مم...... مرغی کا چوزہ لے گیا...... وہ دیکھو اُس درخت پر بیٹھا کیسے اُس چوزے کو کھا رہا ہے......"

"سنتری نے مُڑ کر اُسی درخت کی طرف دیکھا اور پھا کہا......

"جاؤ...... بھاگ جاؤ...... یہاں سے تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ وہ کوّا اس وقت کہاں ہے؟"۔

"کہاں ہے......؟" رحمت جان نے پوچھا۔

"وہ دوسرا ملک ہے اُدھر تم نہیں جاسکتی وہ لوگ تمہیں گولی ماردیں گے، یہاں سے آگے ایک قدم بھی نہ بڑھانا۔

"رحمت جان نے زمین کی طرف دیکھا......وہاں نہ کوئی لکیر تھی نہ نشان۔ایک ہی زمین ایک ہی کھیت ایک ہی جنگل اور نالہ......دوسرے ملک کی کیا شناخت یا پہچان ہے یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔اُس نے سنتری سے کہا......تم اس کوّے کو گولی مار دو......تمہارے ہاتھ میں تو بندوق ہے!"۔

"نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا......اگر میں نے فائر کر دیا تو اُس ملک کا سپاہی بھی جوابی فائر کر دے گا اور پھر جنگ بندی ٹوٹ جائے گی اور لڑائی چھڑ جائے گی!"

"تو اپنے گھر جا......لوٹ جا......ورنہ میں تمہیں بھی گولی مار دوں گا......!"

"واہ تم اُس کوّے کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے جو دن میں کئی مرتبہ تمہاری اس سرحد سے آر پار بغیر اجازت اور پاسپورٹ کے آتا جاتا ہے اور سنو میرا کُتا بھی ایسا ہی کرتا ہے۔آج بھی وہ سرحد کے اُس پار چلا گیا ہے اور ریچھ (بالو) اُدھر سے اِدھر اور اِدھر سے اُدھر جا کر مکئی کھا جاتے ہیں۔بندر لومڑیاں' گیدڑ' شیر' سانپ' بچھو' تتلیاں اور پروانے' چڑیاں اور کوّے چیلیں اور نیولے' کبوتر اور قمریاں......دن بھر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر......

"......بکواس بند کرو......یہ مجھے مت سناؤ یہ جا کر کے اوپر والوں......!"

"کیا یہ پابندیاں صرف انسانوں کیلئے ہیں نام نہاد مہذب انسانوں کیلئے۔......کیا کیا......کیا......؟

لیکن رحمت جان کی بات کا جواب دینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔اُس کی آواز ان پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں گونجتی ہوئی صدائے بازگشت بن کر رہ گئی تھی ......جواب دو ......جواب دو......جواب دو......!"

☆☆☆

جھُنجھنا

خط اس پتے پر لکھیں ''ڈاک خانہ شہیدی چوک محلّہ دلپتیاں دکاندار مشتاق کشتواڑی کو مل غلام رسول پردیسی کو بوقتِ نیک ملے۔

خط کو دوبارہ پڑھنے کے بعد اس نے تہہ کر کے لفافے میں رکھا۔ لفافہ لعاب لگا کر بند کیا اور پھر اُس کے اوپر لکھا۔ ڈاک خانہ شادی پور...... محلّہ میر گاؤں برابری پورہ تحصیل سمن آباد ضلع کشمیر پہنچ کر رحمان میر عرف رمبہ کا کا ولد مرحوم سبحان میر کو بوقت نیک مشرف ہوئے۔ پھر نیچے لکھا چٹھی کا جوا جلدی دیں...... پھر...... کچھ سوچ کر...... اس کے نیچے لکھا۔ میری طرف سے سب برادری والوں کو سلام۔ پھر...... کچھ سوچ کر لکھا۔ زونی ماسی اور ماسٹر گل لون کو بھی سلام کہنا...... اور ہاں میں بھول گیا تھا کہ...... اپنا خیال رکھنا...... پھر وہ قلم دانتوں میں دبا کر سوچنے لگا۔ اور مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلتی چلی گئی...... اور پھر لفافے کے کونے میں بچی ہوئی تھوڑی سی جگہ میں اس نے لکھا...... چلو چل لفافہ کبوتر کی چال...... اگر ہوگی محبت ملے گا جواب...... غلام رسول پردیسی''۔

اور پھر جا کر لفافے کو شہیدی چوک میں نصب ایک لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ وہاں سے ہٹنے سے پہلے غلام رسول نے لیٹر بکس کی طرف دیکھا اور بولا...... اوہو...... ایک ضروری بات لکھنا بھول گیا۔ لعنت ہو میری یاداشت پر۔ خیر چھوڑو اب کیا ہوگا...... جب وہ

وہاں سے چند قدم چلا تو جیب میں بیڑی نکالنے کیلئے ہاتھ ڈالا تو دو چیزیں بیڑی کے ساتھ باہر آ گئیں۔ ایک ڈاک خانہ کا ٹکٹ جو وہ لفافے پر چسپاں کرنا بھول گیا تھا اور ایک سیاہ رنگ کے دھاگے میں بندھا ہوا تعویذ...... یہ تعویذ اس نے شمع کے لئے 50 روپے کے عوض تالاب کھٹیکاں میں ٹھہرے ایک بابے سے لیا تھا۔ جس نے تعویذ اسکے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا تھا......ایک ماہ تک یہ تعویذ شریف کالے کپڑے میں منڈھ کر اپنی بیوی کے گلے میں پہنا دینا اور ہر ماہ کی پہلی جمعرات ایک کالی مرغی ذبح کر کے چاول میں پکا کر محلے کے بچوں کو کھلا دینی چاہیے۔ ہر اتوار صبح دم ایک روٹی گائے کو کھلانا ہوگی......اور ہر چاند کی اٹھائیس تاریخ کو ایک مٹھی چینی چیونٹیوں اور دو مٹھیاں چاول کبوتروں کے آگے ڈالنا نہ بھولنا......انشاءاللہ چودھیوں کے چاند جیسا فرزند پیدا ہوگا......اور......" پیر بابا نے اسے جو باتیں کرنے کی ہدایت کی تھی۔ ان میں سے وہ کچھ باتیں ہی بھول ہی گیا اور پھر تعویذ بھی بھول گیا اور لفافے کے اوپر ٹکٹ لگانا ہی بھول گیا۔ وہ رک گیا۔ پھر جا کر لیٹر بکس کے تالے کو کھینچ کھانچ کر دیکھا اور دیر تک لیٹر بکس کے سامنے اس طرح کھڑا رہا جیسے وہ کوئی چور ہو اور لاکر کو توڑنے یا کھولنے کی تراکیب پر غور کر رہا ہو۔

ایک ہفتے کے بعد مشتاق کشتواڑی نے غلام رسول کو ڈانٹتے ہوئے اطلاع دی کہ ایک "بے رنگ" خط اس کے نام آیا تھا اور ڈاکیہ اُس سے دس روپے لے گیا ہے۔ "ابے تجھے......"بے رنگ" خط ڈالنے کی کیا سوجھی۔ کیا تمہیں خط کیلئے 5 روپے بھی نہ جڑے لاؤ دس روپے دیدو......"

اور غلام رسول نے کشتواڑی سے خط لے کر اُلٹ پلٹ کر دیکھا وہی خط تھا۔ دس روپے کا ایک نوٹ اس نے مشتاق کشتواڑی کی ہتھیلی پر رکھا اور ڈاک خانہ کی طرف چل دیا۔

وہ جب بھی پریشان ہوتا یا وہ کسی قسم کا ذہنی دباؤ محسوس کرتا تو جا کر نوگزیئے پیر کے

آستانے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا۔ یا جامع مسجد کے صحن میں لیٹ جاتا۔

سلیم کے ہاتھ میں پلاسٹک کا خوبصورت جھنجھنا تھا۔ وہ شمع کی گود میں بیٹھا کبھی اس جھنجھنے کو ہلاتا' کبھی منہ میں رکھتا اور کبھی ہمکتا' اُچھلتا' کھلکھلا کر ہنستا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ابو کی طرف دیکھ کر خوش ہوتا' دونوں غلام رسول اور شمع اپنے بیٹے کی بلائیں لیتے اور خوش ہوتے۔ بیٹے کا نام سلیم اُس نے خود رکھا تھا۔ وہ مغل بادشاہ سلیم کی شخصیت سے بہت متاثر تھا جو بہ یک وقت خوب صورت' بہادر اور انصاف پرور اور عالم ہونے کے علاوہ جمالیاتی حس رکھنے والا ایک شاعر بھی تھا۔ وہ یہ سب باتیں اپنے بیٹے کی شخصیت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ سلیم کا نام نقشہ اور خدوخال اس کے اندر ایک عظیم شخصیت کے آئینہ دار تھے اور غلام رسول کو پختہ یقین تھا کہ یہ بچہ نہ صرف اپنے باپ بلکہ پورے قوم' قبیلے اور علاقے کا نام روشن کرے گا۔ پیر سلطان شاہ چوکی والے نے بھی یہی کہا تھا اور پریڈ کی دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے یوگی بابا نے 'س' سے اس کی راشی دیکھ کر کہا کہ لڑکے کا یوم ولادت اور صحیح وقت بتایا جائے تو وہ تفصیلاً اس کا ایک نوٹ بنا کر دے گا۔ جس میں اس کی تقدیر کا حال' حال اور مستقبل' سماجی رتبہ' تعلیم' صحت اور ازدواجی زندگی کے بارے میں راشی کی روشنی میں حالات کی تفصیل ہوگی۔

گھمٹ کی سیڑھیوں پر رکھے گئے گنگا طوطے نے کئی مرتبہ اپنی سرخ چونچ سے نیلا لفافہ نکالا جس پر لکھا تھا' سندر بالک ہوگا ...... ہونہار بروا کے کے چکنے چکنے پات۔ پتا کا ہاتھ بٹائے گا' راج کرے گا' سندر چھوکری سے بیاہ ہوگا۔ گھر میں لکشمی آئیگی۔ بدیش یاترا کرے گا......لمبی عمر پائے گا......وغیرہ وغیرہ۔ غلام رسول ہر تیسرے چوتھے دن چاول کی ایک مٹھی اور بیر اور امرود لا کر گنگا کے آگے رکھ دیتا۔ گنگا کا مالک رام لبھایا غلام رسول سے اب کوئی پیسہ نہ لیتا تھا......ایک زمانہ تھا جب غلام رسول اسے ایک آنہ دیتا تھا پھر نوبت آٹھ

آنے پر آ گئی اور اب رام لبھایا 5 روپے سے کم کسی کو نہ لیتا تھا...... گزشتہ 20 سالوں میں رام لبھایا کے تین طوطے مر گئے تھے وہ ہر طوطے کا نام گنگا رکھتا تھا خواہ اس کا جنس کچھ بھی ہو۔ موجودہ گنگا کو اس کے پنجرے میں آئے ہوئے چھ ماہ ہو گئے تھے اور تین بار بیمار ہوا اور مرتے مرتے بچا۔ نیلا لفافہ یہ ہرا طوطا کئی مرتبہ نکال چکا تھا۔ جس کو دیکھ کر غلام رسول کو گنگا کی ایمانداری کا یقین ہو گیا تھا۔

اُس نے اپنی بانہیں جوں ہی آگے کی طرف پھیلائیں سلیم جھٹ اس کی بانہوں میں آ گیا۔ غلام رسول نے اسے چھاتی سے لگایا۔ چمکارا......اور اسے لیکر باہر نکل گیا۔ اس دن ماسٹر گلہ لون کے بیٹے کی شادی تھی۔ برات دُلہن لیکر واپس آ رہی تھی۔ رحمان بھانڈ شہنائی پر ایک خوبصورت گانے کی دھن بجا رہا تھا "پارتھو گلاس کلنی تل" اتنے میں کسی شریر بچے نے پٹاخہ جلا دیا "ٹھا" کی آواز سے غلام رسول کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سب کچھ وہیں تھا۔ صرف نہ کہیں وہ جھنجھنے والا بچہ تھا اور نہ اس کی ماں، وہ جا چکے تھے۔ غلام رسول نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور سلیم کی صورت کو تصور میں لانے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا۔ پھر بھی ایک ایسے بچے کیلئے اس کے دل میں ممتا اور شفقت جاگ چکی تھی جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا لئے۔ پیر صاحب دعا کیجئے ......درگاہ کے پیر صاحب نے رسمی قسم کی دعا مانگی اور پھر غلام رسول سے مخاطب ہوا۔ ٹھیکے دار صاحب آپ کی طبیعت ٹھیک ہی ہے نا؟ آج آپ کے چہرے پر کچھ پریشانی کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ خیر ہی تو ہے؟" "جی ہاں پیر صاحب۔ آپ کو میں نے بتایا تھا نا کہ اللہ نے اس درگاہ کی وساطت سے مجھے پر ایک ایسی مہربانی کی ہے اور میری دیرینہ منت پوری کی ہے، میں باپ بننے والا ہوں۔ میری بیوی امید سے ہے، آٹھواں مہینہ ہے۔ یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ میرا سلیم آ رہا ہے"، "کون سلیم" پیر صاحب نے پوچھا" اوہ......تو یہ بات

ہے...... پیر صاحب مسکرانے لگے اور غلام رسول وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا......اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دو تین دن کے بعد گھر جانے کی تیاری شروع کر دیگا۔

اس نے اپنی کمائی کے روپے جمع کرنا شروع کر دیئے۔اس کے بینک کھاتے میں اچھی خاصی رقم جمع تھی لیکن وہ پہلے لوگوں کے پاس رکھی ہوئی رقوم وصول کرنا چاہتا تھا۔اس نے دو چار دن میں کالے خان گوجر سے 700' کنک منڈی کے گھشیام سے 1000' لکھ داتا بازار کے مدن لعل سے 620' بس اڈہ کے مشتاق سے 2000 روپے اور گجر نگر کے حاجی محمد ایوب سے 6000 روپے وصول کر لئے اور اسی شام وہ پرانی منڈی پہنچ گیا۔ پہلے اس نے ماں کے لئے چینی مخمل خریدا پھر باپ کیلئے گرم دراز موزے اور زسپن 7 میٹر خریدا اور پھر شمع کیلئے ''تم میرے ہوتے ہو کون'' ساڑھے چار میٹر...... ''راجہ ہندوستانی'' 6 میٹر اور ''ربا میرا دیور دیوانہ'' 5 میٹر اور ایک تبّتی شال خریدا۔ ماسٹر گلہ خان کیلئے ایک مفلر ایک چپل اور ایک جگر ٹوپی خریدنے کے بعد اس نے زونی موسی کیلئے اُسی کی فرمائش پر ''تیرے نام'' 6 میٹر خریدنے اور پھر کھلونے والی گلی کے ''ہری سرن'' سے ایک ٹائے گھوڑا......ایک ٹائے سائیکل......اور ربڑ کا ایک طوطا خریدا......اور یہ سب چیزیں اپنے کمرے میں رکھنے کے بعد اس نے عشاء کی نماز تالاب کھٹیکاں کی جامع مسجد میں ادا کی اور باہر صحن میں آ کر سنگ مرمر کے فرش پر منہ آسمان کی طرف کر کے لیٹ گیا۔آسمان صاف تھا اور ان گنت تارے دور خلاء کی وسعتوں پر جھلملا رہے تھے۔چاند پورا تھا اور پورے آب وتاب سے جلوہ گر تھا ''میرا چاند...... ''اس چاند کی بدلی پر چمکے گا۔میرا اسلیم' میرا چاند......''

اگلے دن اُس نے جیول چوک کے درشن لال سے 800 اور کمپنی باغ کے جیالال سے 2000 روپے وصول کئے۔ بینک سے 20,000 روپے نکالے......اور دیر مارگ کی طرف چل دیا۔گھمٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ایک کھلونے والے کی دکان پر آ کر

بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ایک جھنجھنا خریدا اور جا کر گنگا طوطے والے کے پاس بیٹھ گیا۔ سامنے کی دکان سے چار بابا سوٹ خریدنے کے بعد وہ پھر رام لبھایا کے پاس آ کر بیٹھا۔ اس نے جیب سے حسب معمول ایک مٹھی امرود نکال کر گنگا کے سامنے رکھ دیئے اور رام لبھایا سے باتیں کرنے لگا۔ رام لبھایا نے دو بیڑیاں سلگائیں اور ایک غلام رسول کو دے کر پوچھا "گھر کب جاؤ گے سیٹھ؟" "ایک دو دن میں نکل جاؤں گا...... بیوی کا نواں مہینہ چل رہا ہے' آخری ہفتہ ہے"۔

"پھر تو جانا ہی پڑے گا۔ اگر چھوکرا ہوا تو میرے گنگا کو انعام دینا......!"

اس سے پہلے کہ غلام رسول کچھ کہتا' اس کے گاؤں کا بشیر اس کے سامنے آ کر رک گیا۔ علیک سلیک کے بعد وہ بولا "میں تین گھنٹے سے تمہاری تلاش میں تھا...... مشتاق کشتواڑی نے کہا کہ تم جیول کی طرف گئے ہو۔ دیکھ آئے فلم؟"

"نہیں یار...... میں کام سے گیا تھا' تم گھر سے آئے کب اور مجھے کیوں ڈھونڈ رہے تھے' خیریت ہی تو ہے......؟"

"وہی تو نہیں ......"، "میں!" اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا "کل ہی گاؤں سے آیا ہوں...... پچھلی اتوار کو شمع کو خدا نے ایک چاند سا بچہ دیا ہے" "کیا کہا؟" چاند سا بچہ' میرے خدا...... میرے سلیم کو......"

"ارے آگے تو سنو......!"

"کہو...... جلد کہو...... آگے۔ میرا بچہ تو ٹھیک ہی ہے؟"

"ارے ہاں بچہ اور زچہ دونوں ٹھیک ہیں...... لیکن......!"

"لیکن کیا...... جلد کہو' میرا کلیجہ پھٹ جائے گا!"

"وہ...... بات ایسی ہے کہ گنتی میں ہیرا پھیری ہو گئی ہے۔ یہ میں نہیں کہتا' محلے بھر کی

عورتیں باتیں کرتی تھیں''

''کیسی ہیرا پھیری......کیسی گنتی......ارے تم صاف کیوں نہیں کہتے......کہ بات کیا ہے؟''

''وہ......وہ......دراصل......تمہاری ماں نے......شمع بھابھی کو اس کے مائیکے بھیج دیا ہے!''

''کیوں......بشیرے کیوں......؟''

''محلے کی عورتوں نے چچی کو جا کر کہا کہ......گنتی......میں کچھ ہیرا پھیری ہے......!''

''کیسی ہیرا پھیری......ارے تم بولتے کیوں نہیں......!''

''وہ کہتی ہیں کہ بچہ تمہارے جموں جانے کے دس ماہ بعد پیدا......ہوا ہے۔ یہ وہ کہتی ہیں، میں نہیں''۔ غلام رسول آخری جملہ نہ سن سکا، صرف ''دس ماہ......دس ماہ......اور یہ الفاظ اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے شیشے کی طرح اترتے چلے گئے۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا......کانچ کا جھنجھنا اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ چکا تھا اور اس کے بیچ سے کانچ کے گول گول دانے لڑھک کر گنگا کے سامنے بکھرے ہوئے تھے۔

یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں......؟

یہ ایک عالی شان عمارت تھی۔ اس کے سامنے ایک بہت بڑا میدان تھا۔ اس میدان میں لوگوں کا ایک بے قابو ہجوم تھا...... بہت سے لوگ قطاروں میں کھڑے اُس عمارت کے دروازوں کی طرف دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر ایک کو آگے بڑھنے کی جلدی ہے۔ قطاروں میں جو لوگ کھڑے تھے ان میں نوجوان بھی تھے، بوڑھے بھی، عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ کچھ لوگ چاق و چوبند تندرست و توانا تھے تو کچھ کمزور ضعیف نحیف اور بیمار۔ کچھ لوگوں کے چہروں پے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں کچھ مسرور و شاد ماں! بزرگوں کے ہاتھوں میں چھڑیاں اور بچوں کے ہاتھوں میں کھلونے اور جھنجھنے۔ کسی شخص کو دوسرا آدمی سہارا دیکر آگے کی جانب دھکیل رہا تھا تو بچوں کو مائیں انگلیوں سے پکڑ کر کھینچ رہی تھیں...... کچھ کھانس رہے تھے، کچھ گنگنا رہے تھے۔ ایسا تماشہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں حیران و مبہوت ایک طرف کھڑا اس میلے کا نظارہ کر رہا تھا۔

اتنے میں کچھ لوگ بغلوں میں فائلیں دبائے بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے تو میں بھی اُن میں شامل ہو گیا اور اپنے دائیں بائیں کھڑے لوگوں کو دھکے دیتا ہوا آخر اُس عمارت تک پہنچ گیا۔ جہاں کئی گیٹ تھے جو اندر سے مقفل تھے۔ اندر صرف ان لوگوں کو چھوڑا جا رہا تھا جن کے ہاتھ میں پروانہ راہداری تھما دیا جاتا تھا۔ گیٹ نمبر 1 پر ایک نورانی چہرے والے بزرگ اپنے پیچھے ہرے رنگ کا ایک جھنڈا گاڑھے ایک تخت نما کرسی پر

براجمان تھے۔ ایک بینر اُن کے پیچھے دیوار پر لٹک رہا تھا جس پر لکھا تھا ”آج ہی جنت میں اپنے لئے جگہ بک کروالیجئے۔ جلدی کیجئے' پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ جنت میں داخلے کی ٹکٹ کونٹر نمبر 1 پر مفت دستیاب ہے۔“ بہت سے لوگ اس کونٹر پر پہنچنے کیلئے بے تاب نظر آرہے تھے۔ کچھ لوگ صرف اس لئے ٹکٹ لے رہے تھے۔ لیکن ایسے بھی تھے جو اپنے سارے اہل خانہ بلکہ عزیز واقارب کے لئے بھی داخلے کے کاغذات بنوانے میں مصروف تھے۔ زیادہ تعداد مردوں کی تھی۔ خواتین کی کیو (Que) نسبتاً زیادہ طویل نہ تھی۔

گیٹ نمبر 2 پر ایک بینر لگا ہوا تھا۔ جس کے نیچے دو تین بھلے مانس کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ایک میز پر ایک رجسٹر رکھی ہوئی تھی۔ جس میں وہ کچھ لکھ رہے تھے۔ یہ کہتے یا سنگ تربت بنانے والوں کا کاونٹر تھا۔ نمونے کے طور پر انہوں نے پتھر کی سلوں اور سنگ مرمر کے کتبے وہاں نمائش کے لئے رکھے ہوئے تھے۔ کتبوں پر جو عبارت کندہ تھیں وہ میں نے پڑھیں۔ ایک کتبے پر لکھا تھا ”آئے تھے ہم مثل بلبل سیر گلشن کر چلے۔ لے لو مالی باغ اپنا ہم تو اپنے گھر چلے ...... وفات حسرت آیات ...... پیدائش' وفات ...... مورخہ بمطابق ...... بروز۔ دوسرے پر قرآئی آیات کے نیچے ایک المیہ شعر تھا...... شہید ......اور آگے جگہ خالی رکھی گئی تھی۔ اسی طرح وہاں مختلف ڈیزائن اور قیمتوں کے کتبے سجائے گئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی قیمتوں کے **Sticker** لگے ہوئے تھے۔ امرا' متوسط اور درجہ سوم کے لئے الگ الگ ڈیزائن اور قیمتیں ...... کتبوں کے کاونٹر کے بغل میں ایک گیسو دراز شخص بیٹھا تھا۔ جو کتبوں پر تراشیدہ شعر سپلائی کرتا تھا۔ اس کے سامنے ایک تختی پر لکھا تھا۔ اپنی میت کے کتبے (سنگ مزار) کے لئے بہترین' خوبصورت' رلا دینے والے' المیہ' رزمیہ' بزمیہ' طربیہ اشعار کے لئے ہم سے رابطہ قائم کیجئے۔ پھر ہر قسم کے شعر کی ریٹ لسٹ بھی اس کے پیچھے آویزاں تھی۔

گیٹ نمبر 1 پر کچھ ہنگامہ سا ہوا' آیئے پہلے وہیں چل کر دیکھیں کہ کیا معاملہ ہے ......میں نے دیکھا کہ کچھ "غنڈے" اور موالی نورانی چہرے والے بزرگ پر چڑھ دوڑے تھے۔ اُن میں سے ایک شخص کے منہ سے گالیوں کے ساتھ ساتھ جھاگ نکل رہی تھی۔ میں نے پوچھا "بھائی صاحب کیا بات ہے؟ آپ اتنے غصے میں ...... وہ مکا ہوا میں لہراتا ہوا بولا ...... میں اس کمینے کا خون پی جاؤں گا ...... دیکھیئے دھاندلی بھی تو اتنی ...... ہم برداشت نہیں کریں گے ...... یہ شخص جو جنت کے محکمے کا کاونٹر کلرک ہے' جنت کی درجہ اول' درجہ دوم' درجہ سوم کی ٹکٹیں دینے میں دھاندلی کر رہا ہے۔ دیکھیئے یہ ٹکٹیں ہمارے لئے مفت رکھی گئی ہیں جبکہ یہی ان کے لئے پیسے لیتا ہے۔ ہم یہ کرپشن نہیں ہونے دیں گے۔ اتنے میں جنت کا داروغہ جس کی لمبی لمبی موچھیں اور ہاتھ میں ایک بانس کا ڈھنڈا تھا آگے آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ شکایت کرنے والے سے کچھ پوچھتا اس نے نورانی چہرے والے کاونٹر کلرک کے کان میں کچھ کہا اور ...... ایک درویش نما شخص کی طرف متوجہ ہوا۔ قبلہ آپ ہی انہیں سمجھایئے نا کہ جنت میں جو درجہ بندی اس کے لئے امیدوار کی لیاقت کا معیار کیا ہونا چاہیے ...... بزرگ نے آسمان کی طرف دیکھا' پھر ...... ہواللہ کا فلک شگاف نعرہ لگایا اور یہ اشعار گنگناتا ہوا کسی اور گیٹ کی طرف چل دیا۔

وہاں بھی قیصر و مغرور ہونگے
وہاں بھی فاقہ کش مزدور ہونگے
تیری فردوس میں بھی یا الٰہی
یہی رستے ہوئے ناسُور ہونگے

میں اس کے پیچھے لپکا لیکن وہ بھیڑ میں گم ہو چکا تھا اور میں دھکوں کی مدد سے گیٹ نمبر 4 پر پہنچا۔ وہاں بینر لٹک رہا تھا' اس پر لکھا تھا"۔ اپنے لئے کفن یہاں بک کروالیجیئے۔

بہترین لٹھا' چابی مارکہ...... بوسکی سعودیہ...... خواتین کے لئے الگ اسٹال...... کفن فروش کا لہجہ بڑا مہذبانہ اور تاجرانہ تھا۔ لگتا تھا کہ اس نے امریکہ سے بزنس مینجمنٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس کی ماٹی ویشن اتنی اچھی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی مرنے کو جی چاہتا تھا۔ کفن فروش کے ساتھ دوسری کرسی پر جو شخص بیٹھا تھا وہ چہرے سے کفن چور لگتا تھا۔ وہ کفن کا کپڑا ناپنے پر مامور تھا اور گز میں گرہ مار جاتا تھا۔ جو شخص روپے وصول کرتا تھا وہ کلکولیٹر پر کچھ حساب لگا رہا تھا۔ اس نے کفن فروش کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ آج دھندا کچھ مندہ ہے۔ لگتا ہے کہ صبح بونی کسی کنجوس نے کرائی ہے...... پھر اس نے ایک کاغذ پر لکھا اور میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا...... یہ گیٹ نمبر کے ''جنت بکنگ کونٹر کے مولوی صاحب کو دیدو۔ میں نے پرچی پکڑی اور تھوڑی دور جا کر کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا'' لگتا ہے کہ اب تمہاری آمادگی اور باتوں میں اثر نہیں رہا۔ مجوزہ جنت مکانیوں کی تعداد گھٹ رہی ہے۔ کپڑا پڑا پڑا سڑ رہا ہے۔ آخر ہم اچھا خاصا کمیشن دیتے ہیں۔ جلد جنتیوں کو بھیجو''۔ میں نے وہ پرچی چبا ڈالی' اس کے ساتھ غصہ بھی...... پھر واپس اس جگہ جا پہنچا۔

یہ سٹال دوسرے سٹالوں سے بڑا تھا۔ اسکے ساتھ غسالوں اور قبر کھودنے والے ''گورکنوں'' کے دفاتر بھی قائم تھے' جہاں بکنگ زوروں پر تھی۔ تابوتوں کے لئے ایک ہال تھا...... اس کے آگے مردہ خانہ...... آیئے تشریف لایئے۔ جلدی کیجئے۔ جنت میں اپنے لئے مکان بک کروایئے۔ اے بھائی میں نے کہا چاچا جان۔ ہمشیرہ' خالہ جان' بیٹی' بیٹے' اماں' دادا جلدی کیجئے۔ معمولی کمیشن پر جنت میں داخلہ مفت اعلیٰ درجے کا کفن نمبر 1 لٹھا۔ رعایتی نرخوں پر دستیاب۔ آیئے آیئے۔ مال ختم ہو رہا ہے۔ اپنے لئے سنگ مرمر کے کتبے ہم سے بنوایئے۔ کاریگری کا اعلیٰ نمونہ دیکھئے۔ موزون اشعار و آیات سے مزین' سنگ ہائے مزار رعایتی قیمتوں اور ہر ڈیزائن میں دستیاب۔ جنتیو' بہشتیو' جلدی کرو۔ مرنے والو

غسل ہم سے کروالو......ولایتی صابن سے آزمایئے آیئے دیکھئے۔ جیسے آپ اپنے حمام میں غسل فرما رہے ہونگے۔ آپ کے عاض سیمین پر ہلکی سی خراش بھی نہ آئیگی۔ جنتی بھائیو اور بہنو! تجربہ کار اور ماہر غسالوں کی خدمات حاصل کرو۔ واجب داموں پر۔ ایک دام والے غسال۔ اس Stream میں ڈپلوما ہولڈر، ماسٹرس ڈگری، پی ایچ ڈی وغیرہ وغیرہ...... خواتین کے لئے پیرس کی بیوٹی پارلر یونین کی صدر خود بہ نفس نفیس موجود ہیں۔ عطر اور خوشبوئیں آپ کی Choice پر"۔

سٹال والوں نے اب سپیکروں کا استعمال شروع کر دیا تھا اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں نے وہاں سے بھاگنے کی ٹھانی۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر شخص جو دیوانہ سا لگ رہا تھا۔ بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ سٹال نمبر 4 پر آپہنچا۔

"میرا کفن کہاں ہے؟ میں نے چار دن پہلے بک کروایا تھا"۔ اس نے کاونٹر کلرک سے پوچھا۔ "جناب آپ رسید دکھایئے"۔ کاونٹر کلرک نے ادب سے کہا" ادھیڑ عمر کے شخص نے رسید دکھائی تو وہ بولا" یہاں سے آگے بڑھئے مردہ خانے میں آپ کا کفن آپ کے تابوت میں آپ کو اپنی آغوش میں چھپانے کے لئے منتظر ہے"۔

وہ شخص اندر جانے کے لئے اُتاولا نظر آرہا تھا۔ گیٹ کیپر نے دروازہ کھولا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گالیاں بکتا ہوا پھر باہر آگیا۔

"بتاؤ یہ میرے کفن میں کس کی لاش ہے۔ ارے یہاں بھی دھاندلی؟"

کاونٹر کلرک اُٹھ کھڑا ہوا۔ آیئے دیکھتے ہیں۔

جوں ہی وہ گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو میں نے بھی اُنکے پیچھے اندر جانے کی کوشش کی۔ گیٹ کیپر نے مجھے روکتے ہوئے کہا" جناب آپ اندر نہیں جاسکتے۔ اس گیٹ کے آگے یا تو مردے جا۔ تے ہیں یا ان کے لواحقین یا محکمے کے لوگ......"

میں نے کہا ''میں میڈیا کی طرف سے آیا ہوں اور ہفت روزہ ''عدم'' کا نمائندہ خصوصی ہوں۔ اس کمینے نے پھر بھی نہ مانا۔ جناب میڈیا والوں کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں''۔ میں نے ''سو روپے'' کا ایک نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھا تو وہ کمینہ مسکرایا اور پھر بولا۔ ''جناب یہ سب سے زیادہ Authentic شناختی کارڈ ہے۔ اندر تشریف لے آیئے۔''

مردہ خانے میں اس تابوت کے پاس وہ ادھیڑ عمر کا شخص اس کاونٹر والے کے ساتھ کھڑا تھا۔ کاونٹر والے نے لاش کے گلے میں بندھا ہوا رجسٹریشن نمبر دیکھ کر کہا ''آپ کے کفن میں جو شخص گھس گیا ہے اس کا نام...... ہے۔ اس کے باپ کا نام......گھر کا پتہ وہی جو آپ کا ہے......''

''نہیں......! یہ نہیں ہو سکتا...... یہ تو میرے بیٹے کا نام ہے! اس نے ایسا کیوں کیا......؟ باری تو میری تھی۔ اب میرے تابوت کو کون کندھا دے گا؟''

''جناب یہ کارستانی اُس جنت والے کاونٹر کلرک کی ہے......اس لڑکے نے جنت کی لالچ میں اسے کچھ زیادہ کمیشن دے ڈالا ہے اور اس نے اسے جلدی جنت کی ٹکٹ تھما دی ہے''۔ اور ہمارے کاونٹر سے بھی اس نے ہمارے کسی ملازم کو کرپٹ کر کے وہی نمبر حاصل کر لیا ہے جو آپ کا تھا' اب آپ انتظار کیجئے۔ آپ کا نمبر بھی جلد آجائے گا۔ تاخیر اور اس بے ایمانی کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں......اور ساتھ ہی ہمیں افسوس ہے کہ اب آپ ہی کو اپنے بیٹے کا جنازہ اپنے کندھے پر اٹھانا پڑے گا۔ اور باقی ماندہ زندگی میں اس کی بے وقت موت کا گہرا زخم اپنے سینے میں لے کر جینا ہوگا''۔

آدھی سواری

اس روٹ پر چلنے والی سبھی بسوں میں مسافر سوار نہیں ہوتے تھے بلکہ انہیں بس میں ایسے بھرا جاتا تھا جیسے دیہاتی لاتوں، گھونسوں اور مکوں کے بڑے بڑے مٹکوں میں ساگ بھر کے اچار ڈالتے ہیں اور رائی اور دھنیا کے دانے برابر بھی جگہ خالی نہیں رہنے دیتے۔ شہر کے مضافات میں چلنے والی بسوں میں صبح شام بلا کا ہجوم رہتا ہے۔ جب سرکاری ملازم، تاجر، طلبا و طالبات، مزدور و محنت کش یا تو دفاتر سکول یا کام پر جاتے ہیں یا چھٹی کے بعد گھر لوٹتے ہیں۔ یہ آئے دن کا معمول ہے اور اب تو لوگوں کو اس کی عادت سی ہو گئی ہے۔ جس دن رش نہیں ہوتا لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہوئے نظر آتے ہیں ''آج کیا بات ہے؟'' سواریاں کہاں ہیں، آج ہڑتال تو نہیں...... یا پھر اگر موسم فصل کٹائی یا بوائی کا ہوتا ہے تو مسافروں کی تعداد میں کمی آجاتی ہے۔

آج شہر سے محمود آباد جانے والی بس کی چھت پر بھی کچھ مسافر بیٹھے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ بس کے اندر اور ورلوڈنگ کے بعد بھی مسافر بچ گئے تھے اور اپنی مرضی سے بس کی چھت پر جا بیٹھے تھے۔ کیونکہ انہیں ہر حال گھر پہنچنا تھا اور وہ بھی شام سے پہلے...... کیونکہ بعض مسافروں کو روڈ ہیڈ سے آگے بھی جانا تھا اور نومبر ہونے کے سبب دن چھوٹے تھے۔ اس معمول میں کبھی بھی فرق نہ آتا۔ بس والے اور ٹریفک پولیس

کے حکام کی بھی خوب کمائی ہوتی تھی۔ لوگ بھی احتجاج نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں۔ بلا وجہ بک بک کر کے اپنا وقت ضائع کیوں کریں۔

ایک دن ایک نئے نئے فائر برانڈ لیڈر نے بس کے اندر کھڑے ہو کر تقریر بھی کی تھی اور سرکار سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ لوگوں کی جان و مال کا لحاظ رکھ کر ڈرائیور کو بسوں میں دو گنی اور تین گنا زیادہ سواریاں بھرنے پر پابندی لگائیں اور ایسے ڈرائیوروں اور مالکان کے خلاف قانونی کارروائی کریں کیونکہ آئے دن سڑک حادثات میں بے تحاشہ اضافہ ہو رہا ہے۔ لیڈر صاحب نے ایک بات بڑے پتے کی بتائی کہ سڑک حادثے میں مرنے والوں کے لواحقین کو سرکار کی طرف سے ایک ایک لاکھ روپے بطور ایکس گریشیا امداد دی جاتی ہے۔ 100 جانیں بھی جائیں گی اسکے علاوہ کئی کنبے اجڑ سکتے ہیں۔ بس بھی گئی' اتنے سارے نقصانات ہونے کا احتمال ہے اور اس کے پیش نظر سرکاری مشینری حرکت میں آئے۔

اور پھر سرکاری مشینری ضرور حرکت میں آ گئی اور اس لیڈر صاحب کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا اور اس کی ایسی مرمت کی کہ بے چارے نے ہمیشہ کے لئے لیڈری سے توبہ کر لی۔

آج کی بس میں وہ صاحب بھی موجود تھے۔ آج وہ ایک آرام دہ سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جس دن انہیں سرکاری مشینری کی حرکت میں نہ آنے کی شکایت تھی اس دن وہ اوور لوڈنگ میں کھڑے کھڑے مسافروں کے دھکوں کو برداشت کر سکے تھے۔ آج صاحب سیٹ پر کھڑکی کی جانب براجمان تھے اور تازہ اخبار پر آنے والے چوبیس گھنٹوں کے بارے میں موسم کے ماہرین کی پیش گوئی پڑھ رہے تھے۔ ان کے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا ہوا ادھجلا سگریٹ ان کی بے حسی کی دلالت کر رہا تھا۔ ان کے پہلو والی سیٹ میں بیٹھا ہوا سات سال کا ایک لڑکا کتابوں کا بستہ اپنی جھولی اور بانہوں میں پکڑے

بیٹھا تھا اور بس کنڈ یکٹر نے تین مرتبہ اس سے کرایے کے پیسے طلب کیئے تھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس لڑکے نے کرایہ دینے سے انکار کر دیا تھا بلکہ وہ پچاس فیصد کم کرایہ دے رہا تھا۔

کنڈ یکٹر پھر وہاں سے گزرا اور بچے کو گریبان سے پکڑ کر سیٹ سے اُٹھا کر پیچھے کی طرف دھکیلا ''چل پیچھے بھکاری کہیں کا۔ اگر تمہارے پاس پیسے نہیں ہوتے تو تم بس میں کیوں سوار ہو جاتے ہو......؟ جہنم میں جاؤ' یہاں آدھی سواری نہیں چلتی۔ پورے پیسے دے دو ورنہ کھڑے رہو۔ ادھر دیکھو' کیا لکھا ہے۔ ''آدھی سواری کو سیٹ نہیں ملے گی۔''

طالب علم اوور لوڈنگ میں کھڑا شاید سوچ رہا تھا کہ وہ کیسے آدھی سواری ہونے لگا' وہ تو اس سماج کا ایک صحیح وسالم آدمی ہے اور اگر وہ بچہ ہے تو کیا وہ آدھا ہے؟ آدھی سواری' کیا وہ پورا آدمی نہیں ہے؟ رہ رہ کر اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا۔ کنڈ یکٹر نے پھر چلا کر کہا ''اوے لڑکے آگے چل۔ دیکھتا نہیں کہ بس میں کتنی جگہ خالی ہے۔ بچہ آگے کی طرف کھسک گیا۔ وہ جگہ بناتا ہوا بزرگوں کے پہلوؤں سے دامن بچاتا آگے بڑھتا۔ کسی سواری کی دو ٹانگوں کے بیچ سے راستہ بناتا ہوا آگے اس جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوا جسے ڈرائیور لوگ بونٹ یا بانٹ کہتے ہیں۔ جس پر پینٹ کیا ہوا تھا۔ مجھ پر مت بیٹھیئے یا مجھ پر پیر مت رکھیئے میں آپ کی خدمت کرتا ہوں لیکن اس پر دو خواتین کے علاوہ چار اور مسافر آرام سے بیٹھے اپنا پہلو گر مار ہے تھے۔ فرنٹ سیٹ پر براجمان ایک دانشور قسم کا آدمی بس ڈرائیور کے ساتھ اخلاقیات کے موضوی پر بحث کر رہا تھا۔ ڈرائیور کے آگے لکھا تھا'' ان اللہ مع الصابرین یرزق من یشا بغیر حساب'' سگریٹ پینا منع ہے اور I L U' ڈرائیور کے ہونٹوں میں چار انچ لمبا سگریٹ دبا ہوا تھا اور بس میں دھوئیں کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اچانک ایک مقام پر بس رکی دو تین سواریاں بس میں سوار ہوئیں اور ان کے پیچھے کنڈ یکٹر بھی اگلی کھڑکی سے سوار ہو گیا۔ آتے ہی طالب علم پر برس پڑا۔ ابے تجھے میں نے کتنی بار کہا کہ

پیچھے چلو۔ سنتا ہیں نہیں کہیں تم بہرے تو نہیں ہو گئے ہو۔ لڑکا بے چارہ لوگوں کے دائیں بائیں اور نیچے سے نکلتا ہوا پھر پیچھے جا کھڑا ہوا۔ وہ بس کی اندرونی دیوار پر پینٹ کیے ہوئے سلوگن اور شعر بڑی دلچسپی سے پڑھ رہا تھا۔

''سواری اپنے سامان کی خود ذمہ دار ہوگی''، ''کھڑکی سے سر اور بازو باہر مت نکالو''، ''بس میں تھوکنا منع ہے''، ''سیاسی گفتگو نہ کریں''، ''ڈرائیور کو تیز چلنے پر مجبور نہ کریں''۔

ڈرائیور کی زندگی گاڑی کی رفتار پر، بلبل کی زندگی موسم بہار پر۔

ڈرائیور کی ذات مایہ الزام ہوتی ہے، نگاہ کتنی بھی نیچی ہو پھر بھی بدنام ہوتی ہے۔

ہر بشر کو لازم ہے کہ صبر کرنا چاہیے، جب کھڑی ہو جائے گاڑی پھر اُترنا چاہیے۔

چلتی گاڑی سے اترنا منع ہے۔

مقدر میں جو سختی تھی وہ مر کر بھی نہیں نکلی، قبر کھودی گئی میری تو پتھریلی زمین نکلی۔

اُجالے اپنے یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو''یرزق من یشاء بغیر حساب'' نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے۔ ڈرائیور نے گاڑی کے ڈیک پر ایک بیہودہ اناپ شناپ گانا بجایا اور آواز کا Volume اتنا اونچا کر دیا کہ کان پھٹنے لگے۔ بچہ پریشان ہو گیا۔ ایک حاجی صاحب جو ابھی تک نیند کر رہے تھے۔ جاگے اور پھر آنکھیں بند کر کے خراٹے لینے لگے۔

گانے کے بول کچھ اس طرح تھے۔

ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ نو دس
گیارہ بارہ آج صنم تیرا مجھے انتظار

لیڈر کی اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون سردار حکومت سنگھ کے کندھے پر سر ٹکائے محو خواب تھیں اور اسکے گوشہ دہن سے نکلنے والا لعاب سردار جی کی قمیض کی جیب میں جمع ہو رہا

تھا۔سردار جی نے دوتین مرتبہ اس خاتون کو کنکھیوں سے دیکھا اور پھر ہونہہ کہہ کر منھ دوسری طرف موڑلیا

ایک شخص نے ریڈیو آن کر دیا۔بس میں سوار مسافروں میں سے صرف ایک لڑکا ریڈیو سننے لگا۔خبریں چل رہی تھیں۔ نیوز ریڈر نے کہا'' آج ساری دنیا میں بچوں کا عالمی دن منایا جارہا ہے۔اس سلسلے میں سرکار نے بچوں کے فلاح و بہبود کے کاموں کے لئے کئی اقدامات کا اعلان کیا ہے۔وزیراعظم نے کہا ہے......'' کہ بچے......'' وہ صرف اتنا ہی سن سکا کیونکہ کنڈ یکٹر نے اسے پھر آواز دی اے چھوٹو' آگے چل تجھے کتنی دفعہ کہوں......؟

لڑکا آگے اور نہ پیچھے کی بات سوچ رہا تھا۔وہ صرف ایک بات سوچ رہا تھا کہ وہ تو پورا ہے پھر آدھی سواری کیسے ہوگیا۔

پیلی پگڑی نیلی دیوار

میں جس سکول میں پڑھاتا تھا وہ آٹھویں درجے تک تھا اور میرے علاوہ سات ٹیچر اور بھی تھے۔ طلباء اور طالبات کی تعداد اگرچہ زیادہ نہ تھی پھر بھی ہر فرقے کے بچے اپنی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے پڑھنے آتے تھے۔ اساتذہ بھی تینوں فرقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چار استاد مسلمان تھے، تین پنڈت اور ایک سکھ۔ مجھے چھوڑ کر چار استاد غیر مقامی تھے اور سکھ استاد ایک پنڈت اور میں مقامی (لوکل) تھے اور اکثر چار بجے کے بعد بھی سکول میں بیٹھے رہتے تھے اور دنیا کے ہر موضوع پر بحث اور مناظرہ کرتے۔ جس میں اکثر میں ہی جیت جاتا تھا۔ راج ناتھ کو سیاسی باتوں میں دلچسپی نہ تھی البتہ تاریخ پر اس کی نظر زیادہ گہری تھی۔ وہ ریڈیو سے صرف فرمائشی پروگرام سنتا تھا۔ کشمیری موسیقی اور فلمی گانے لیکن جو مضامین وہ پڑھاتا تھا ان پر اس کو مکمل دسترس حاصل تھی۔ ریاضی اس کا پسندیدہ مضمون تھا اور اس کے دو بچے بھی اسی سکول میں ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ سرجیت سنگھ عرف جیتا ہر بحث میں برابر شریک رہتا اور جب بحث طول کھینچتی تو وہ ایک وسیع انگڑائی لے کر کہتا ''ارے یار مار ولعنت' خواہ مخواہ اپنا دماغ خراب ہو گیا مجھے تو ابھی گائے کے لئے گھاس لانی ہے۔ چلو یارو چلو......!'' سرجیت کو سب سے زیادہ دلچسپی کھیلوں سے تھی۔ سکول کے کلچرل کلب کا وہی انچارج تھا۔ ٹائم ٹیبل میں جو مضامین اسے الاٹ کئے گئے تھے ان میں ''دینیات'' بھی تھا جو اسے پانچویں جماعت کے بچوں کو پڑھانی ہوتی اور کمال کی بات یہ

ہے کہ اس نے بچوں کو سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص بھی یاد کروالی تھیں اور چھ کلمے بھی اُن سے روز سنتا تھا اور ایک دن کلاس چھوڑنے سے پہلے طلباء کو دھمکی دے گیا کہ اگر کل تک انہیں دس کلمے یاد نہ ہوئے تو وہ ان کی چمڑی ادھیڑ کے رکھ دے گا۔ سرجیت سکول سے بمشکل 5 منٹ کی مسافت پر رہتا تھا اور اکثر دس بجے سے پہلے ہی ڈیوٹی پر حاضر ہو جاتا تھا اور سکول کے لان میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان بیٹھ جاتا اور روزانہ نئے نئے گانوں کی مشق کرتا۔ اس کے چار بچے پانچویں، چھٹی اور ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے جن کے نام بالترتیب امر جیت عرف کاکا، بلبیر عرف بلا اور چرن جیت عرف پپو اور ایک لڑکی دوسری جماعت کی طالبہ تھی جس کا نام ڈالی تھا، بڑی پیاری بچی تھی۔ سرجیت نے اسے بابا فرید کی کافیاں اور ہیر وارث شاہ کے کچھ اشعار بھی یاد کروالئے تھے جو جمعہ کے دن دوسرے ہاف میں ہونے والی میٹنگ میں سناتی تھی۔ راج ناتھ جمعہ میٹنگ کا انچارج تھا اور اس کی بدولت ہمیں اچھے اچھے گانے سننے کو مل جاتے تھے۔ غلام محمد فارسی کے استاد تھے اور سرجیت سنگھ اسے تیلی کہتا تھا۔ لیکن غلام محمد کبھی برا نہیں مانتا تھا ایک دن عبدالرزاق لون اور شمس الدین شاہ میں کچھ مذہبی بحث چھڑی ہوئی تھی کہ سرجیت سنگھ بھی آ گیا آتے ہی پوچھا ''بولو...... میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں''، شمس الدین صاحب بولے ''نہیں یار ہمارے بیچ کچھ مذہبی بحث ہے تم کو کیا معلوم؟'' سرجیت کو غصہ آ گیا'' کیا کہا مجھے کیا معلوم، ارے میں بتا سکتا ہوں کہ حضرت محمد صاحبؐ کے دادا اور والد صاحب کا کیا نام تھا۔ وہ کہاں پیدا ہوئے اور مکہ شریف سے کب ہجرت کی۔ ان کے چار یاروں کے کیا نام تھے؟ اور ان کے کون کون دشمن تھے؟ بولوں......؟ ارے پانچویں والوں کو سب دینیات یاد کروائی ہے!''

''مگر...... جس بات پر ہماری بحث لگی ہے وہ بہت مشکل مسئلہ ہے۔ اس کا جواب صرف کوئی مولوی یا عالم ہی دے سکتا ہے!''

''اچھا......اچھا اس طرح کہونا......میں نے سوچا تھا میں شاید تمہاری مدد کرسکوں۔ خیر......اچھا میرے ایک سوال کا جواب تم دو تو مانوں......''وہ کونسی جگہ ہے جہاں نماز کسی بھی صورت میں پڑھنا جائز نہیں۔'' شمس صاحب اور رزاق صاحب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے......اتنے میں رسس کا وقت ہوا اور سب بحث چھوڑ کر اپنی اپنی کلاسوں کی طرف چل پڑے۔ سرجیت سنگھ کا آخری پیریڈ پانچویں جماعت میں ہوتا تھا۔ ایک دن میں پانچویں جماعت کے کمرے کے سامنے سے گزرا اور دروازہ کھلا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لڑکیوں کو چھوڑ کر باقی سب لڑکے جس میں سرجیت کا لڑکا کاکا بھی شامل تھا مرغے بنے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا ''یاران سب کو مرغا کیوں بنادیا؟'' کہنے لگا کہ یہ سخت نکھے اور جھوٹے ہیں۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ دس کلمے یاد کر کے لانا آج پندرہ دن ہو گئے آج کہتے ہیں کہ جناب کتاب میں صرف چھ کلمے ہیں......''اب آپ ہی بتائیے کتنے جھوٹے ہیں۔ یہ سن کر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگا'' آپ ہنستے کیوں ہیں؟ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے کہا......''ادھر آؤ'' میں اسے باہر لایا اور اسے سمجھایا کہ یہ بچے ٹھیک ہی تو کہتے ہیں'' کلمے صرف چھ ہوتے ہیں......''''اچھا......! وہ! میں نے خواہ مخواہ ان کو مرغا بنادیا'' وہ دوڑ کر گیا اور حکم دیا ''سٹینڈ اپ......'' سب کھڑے ہو گئے'' بیٹھ جاؤ تم ٹھیک کہتے تھے مجھے معاف کر دینا......!''

ایک دن میں ساتویں جماعت کے بچوں کو ''لل عارفہ'' سبق پڑھا رہا تھا......اس جماعت میں چار پنڈت لڑکے بھی تھے دوران سبق میں نے بچوں سے پوچھ ڈالا......''اچھا مجھے بتاؤ کہ ہندو اور مسلمان میں کیا فرق ہوتا ہے؟ (یہ الگ بات ہے کہ یہ سوال پوچھ کر میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ مجھے ایسا سوال بچوں سے نہیں پوچھنا چاہئے تھا) ہر روز کی طرح پہلے سنیل نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ سر میں بتا سکتا ہوں!'' میں نے کہا ''بتاؤ'' ''سر ہندو اپنے

مکان کی دیوار پیلے رنگ سے لپائی کرتے ہیں اور مسلمان نیلے رنگ سے!''

اتنے میں اسلم نے ہاتھ اٹھایا ''سر میں بولوں؟''

''ہاں ہاں کہوں......!''

''سر ہندو پیلی پگڑی باندھتے ہیں اور مسلمان سفید......!''

سرجیت کا بیٹا ''پپو'' بھی اسی درجے کا طالب علم تھا وہ کچھ پریشان سا لگتا تھا میں نے اس سے پوچھا ''پپو'' بیٹے تم کیوں چپ اور اُداس ہو تم بھی کچھ کہو نا......!''

''سر میرے باپو بھی کبھی سفید پگڑی باندھتے ہیں کبھی پیلی۔ کبھی نیلی کبھی کالی......وہ کیا ہیں......؟''

''میں نے کہا......وہ تو ہیں سکھ لیکن سب انسان ہیں۔ بھائی بھائی ہیں۔ رنگوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... ہندو مسلمان سکھ عیسائی بودھ پارسی سب کے ظاہری رنگ اور کپڑے الگ الگ ہو سکتے ہیں لیکن ہم سب کی رگوں میں دوڑنے والے لہو کا صرف ایک ہی رنگ ہے اور وہ ہے......؟'' ''لال'' سب بچے ایک ساتھ بول پڑے۔

چار بجے سرجیت نے آکر اطلاع دی کہ راج ناتھ کے پتا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس لئے ہم سب نے فیصلہ کیا کہ ابھی اس کے گھر چلا جائے۔ چنانچہ ہم ساتوں استاد راج ناتھ کے گھر پہنچے۔ میں نے راج ناتھ کے پتا امر ناتھ سے آج کلاس میں ہوئے سوال و جواب کا ذکر کیا تو سب ہنسنے لگے۔ امر ناتھ نے لیٹے لیٹے کہا ''وہ کیا گانا ہے...... کہ ''بچے من کے......'' راج ناتھ نے بات کاٹ کر کہا ''بچے من کے سچے ساری جگ کے آنکھ کے تارے......جوں جوں ان کی عمر بڑھے اُن کے من میں کرودھ بڑھے......''۔

چائے پینے کے بعد جب میں اور سرجیت واپس آ رہے تھے تو سرجیت رک کر اپنے باغ کی طرف دیکھنے لگا ''وہ مارا......ارے یار یہ میرے گلاس کے بوٹے پر کون

چڑھا ہے؟" وہ دوڑ کر وہاں پہنچا میں بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچا دیکھا تو ماسٹر غلام محمد کا بیٹا شفیع اور راج ناتھ کا بیٹا سنیل درخت کی شاخ پر سہمے ہوئے بیٹھے ہیں دونوں کی آنکھیں بھر آئیں......

ارے نیچے اترو شیطانو......میں تمہاری دھلائی کروں...... بدمعاشو! تمہیں میرا ہی چیری کا بوٹا ملا تھا! ہیں؟" وہ دونوں لڑکے ڈرتے ہوئے نیچے اترے"" چلو ادھر مرغے بن جاؤں دونوں!"

"سر ہمیں ہاتھوں پر کٹ مارو یا پھر معاف کردو"

سنیل نے کہا......"ہم نے اتنے گلاس کھائے ہیں کہ ہم جھک نہیں سکتے" شفیع نے کہا:

"اچھا ٹھیک ہے......ٹھہرو میں چھڑی لاتا ہوں......!" سرجیت چھڑی ڈھونڈ نے لگا اسی لمحے اس کے اپنے بچے دوڑے آگئے "باپو انہیں مت مارو یہ ہمارے دوست ہیں......!"

"تمہارے دوست ہیں؟ یہ لڑکے تمہارے دوست ہیں اور تمہارے باپ کے دشمن۔ میرے سارے گلاس کھا گئے......!"" سارے نہیں سر تھوڑے سے کھائے۔ اس سے زیادہ تو طوطے اور کوے کھا جاتے ہیں"

ارے وہ تو پرندے ہیں مگر تم تو انسان ہو......!"" معاف کردو سر......!"

"اچھا ٹھہرو......اس نے سیٹی سجائی تو اس کا پالتو کتا دوڑتا ہوا آگیا سرجیت نے اسے بیٹھ جانے کے لئے کہا"" اچھا دیکھو......میں اس درخت پر چڑھونگا ایک چھڑی توڑنے کے لئے......تم بھاگنا نہیں ورنہ یہ کتا تمہیں پکڑ کر کاٹ دے گا......!"

"سمجھے؟"

''جی''

یہ کہہ کر وہ درخت پر چڑھ گیا ہم سب بیٹھ کر اس کے اترنے کا انتظار کرنے لگے وہ پکے پکے گلاس توڑ کر اپنی جھولی میں جمع کر رہا تھا اور پھر پانچ منٹ کے بعد وہ نیچے اترا اور دونوں ''چوروں'' کو بلایا دیکھو تمہاری سزا یہ ہے کہ تم یہ گلاس بھی کھاؤ......!''

''نہیں سر ہمارا پیٹ پھٹ جائے گا......اب ہم ایک دانہ بھی نہیں کھا سکتے......!''

''حرام خورو......تم نہیں کھاؤ گے؟ تمہارا باپ بھی کھائے گا......!''

''جی سر وہ ضرور کھائے گا......''

''سر جیت کا سارا غصہ ختم ہو رہا تھا وہ زور زور ہنسنے لگا اور دونوں لڑکوں کی جھلیاں گلاسوں سے بھر کر بولا'' ارے جاؤ پترو۔ کھلاؤ اپنے باپوں کو۔ تم بھی کیا یاد رکھو گے......'' یہ درخت تو تمہارے اپنے ہیں تم میں اور ان بچوں میں کیا فرق ہے......تم جب بھی چاہو جو پھل چاہو کھا سکتے تم بھی کیا یاد رکھو گے چورو۔ تم نہیں کھاؤ گے تو پھر کون کھائے گا آخر تم سب ہی تو اس باغ کے مالک اور وارث ہو!''

'''سب لڑکے ہنستے اچھلتے کودتے باغ سے باہر آ گئے اور اس میدان کی طرف دوڑنے لگے جہاں گاؤں کے دوسرے بچے کھیل رہے تھے۔
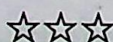
ایک دن کا کلینڈر

ڈارلنگ ڈان ہیلتھ کلینک پر حسب معمول آج بھی زبردست بھیڑ تھی۔ مردوں کے ساتھ دوسری قطار خواتین کی تھی۔ ضعیف اور ناتواں بوڑھے، جوان، کم سن بچے۔ غرض ہر عمر کے بیمار کراہتے، کھانستے، جلد از جلد ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے بے تاب تھے۔ کلینک کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ مریضوں کا صبر ختم ہو رہا تھا اور غصہ بڑھ رہا تھا۔ "حد ہوگئی۔ ہم لوگ مر رہے ہیں اور ڈاکٹر صاحب دروازہ کھولنے کا نام تک نہیں لیتے"۔ ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے آگے بڑھ کر بلند آواز میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ شخص خود بیمار نہیں تھا بلکہ ایک مریض کے ساتھ آیا تھا۔ وہ اپنے لئے راستہ بناتے بناتے دروازے تک پہنچ گیا۔

کچھ لوگوں نے سمجھا وہ کیو توڑ کر اپنے لئے اندر جانا چاہتا ہے۔ دو ایک بیماروں نے اعتراض کیا...... "جناب ہم صبح سے یہاں کھڑے کھڑے تھک چکے ہیں، آپ مہربانی کر کے اپنے نمبر پر کھڑے رہیں، کیو نہ توڑیں"۔ میں کیو نہیں توڑتا میں اندر جا کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اندر کیا کر رہے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے دروازے پر زور سے ٹھوکر ماری "دروازہ کھولئے" اور دروازہ کھول دیا گیا۔ ایک مریل شکل کے کمپاؤنڈر یا اسسٹنٹ نے جھانکا "دیکھئے، آپ ذرا صبر کیجئے، دراصل ڈاکٹر صاحب اندر نہیں ہیں۔ میں موبائل پر ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن یا تو نیٹ ورک بزی آ رہا ہے یا پھر ڈاکٹر

صاحب کا سوئچ بند ہے اور ابھی ابھی کمپیوٹر نے کہا ہے کہ وہ آؤٹ آف ریچ ہیں"۔ دراصل یہ سسٹم روز بروز خراب ہوتا جارہا ہے۔ جس مقصد کیلئے یہ فون ہم نے رکھے تھے وہ پورا نہیں ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ جب وہ یورپ میں تھے تو وہاں کا سسٹم ......"

"بھاڑ میں جائے تمہارا سسٹم...... میں پوچھتا ہوں ڈاکٹر صاحب کہاں ہے۔ ادھیڑ عمر شخص نے اسسٹنٹ کی باتوں سے تنگ آکر اس کی بات کاٹ کر پوچھا "جناب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اکلوتے فرزند کی دونوں آنکھوں میں کچھ تکلیف تھی وہ ایک گھنٹہ پہلے اسے آنکھوں کے ماہر ڈاکٹر کے پاس لے گئے ہیں' جو یہاں سے تقریباً 15 کلومیٹر دور ہے۔ اپنی گاڑی میں گئے ہیں' تھوڑی ہی دیر میں آتے ہونگے۔ جی!" ڈاکٹر صاحب تو نہ آئے لیکن ان کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسسٹنٹ تیزی سے میز پر رکھے ہوئے فون کی طرف لپکا "جی۔ جی۔ جی ہاں' جناب۔ جی بہتر۔ جی سلام" اس کے بعد وہ دروازے پر آیا اور قطار میں کھڑے مریضوں سے مخاطب ہوا۔ "ڈاکٹر صاحب نہیں آسکتے۔ اُن کے بیٹے کی آنکھوں میں کچھ گڑ بڑ ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ سب "پے شنٹوں" کو کہہ دو کہ وہ شام کے 5 بجے تشریف لائیں گے۔ آپ اپنے اپنے کارڈ جمع کروالیجئے۔ میں اسی ترتیب سے شام کو بلاؤں گا۔

ڈاکٹر فضل اور اس کی بیگم اپنے بچے کو لے کر جب "آنکھوں کی تکالیف کے ماہر معالج ڈاکٹر عالم کے مطب پر پہنچے تو وہاں بھی لوگوں کی ایک لمبی قطار دیکھ کر ایک بیمار سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب ہیں کیا؟"

مریض نے جواب دیا "پتہ نہیں جناب دروازہ ہی نہیں کھولتے۔ ڈاکٹر فضل نے آئی اسپیشلسٹ ڈاکٹر عالم کا نمبر اپنے موبائل پر ڈائل کیا تو دوسری طرف سے جو آواز آئی وہ صرف ڈاکٹر فضل ہی سن پائے اور پھر وہ مایوس ہو کر وہاں کھڑے بیماروں کی طرف مڑے۔

ڈاکٹر صاحب نہیں آئینگے وہ اپنی بیوی کو نرسنگ ہوم لے کر گئے ہیں۔ جہاں اُن کا آپریشن ہونے والا ہے۔ پہلی ڈیلیوری ہے"۔ "اوہ...... پھر کیا ہوگا"۔ آپ لوگ 4 بجے تشریف لائیے"۔

اس کے بعد وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ چلو ڈاکٹر سنگھ کے پاس چلتے ہیں۔ وہ تو ہسپتال جاچکا ہوگا۔ وہیں اس سے ملیں گے۔ ڈاکٹر عالم جب نرسنگ ہوم پہنچے تو سب سے پہلے ڈاکٹر روبینہ کے بارے میں ریسپشن سے پتہ کیا...... استقبالیہ کونٹر پر بیٹھی ہوئی ایک میڈیم نے کہا "سر ڈاکٹر روبینہ تو نہیں ہیں۔ دراصل ان کے ہسبنڈ کو آج صبح ماسیو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ انہیں لے کر اسپتال گئی ہیں۔ مجھے کہہ کر گئی تھیں کہ آج وہ کوئی کام نہیں کر سکیں گی......"۔ "اوہ...... کیا یہاں کوئی اور ڈاکٹر نہیں؟" "سر ڈاکٹر شہناز ہیں لیکن وہ تو ایک جونیئر سرجن ہیں اور آپ......؟" "نہیں نہیں۔ اس سے نہیں کروانا" یہی کہہ کر ڈاکٹر عالم مڑے اور سیدھے اپنی گاڑی میں جا بیٹھے جہاں اس کی بیوی دردزہ سے کراہ رہی تھی۔

......ڈاکٹر روبینہ نے سرکاری اسپتال کی انکوائری پر جاکر پوچھا "میڈم وہ ابھی ابھی کہیں نکلے ہیں۔ کچھ پریشان سے لگ رہے تھے۔ کہں گئے معلوم نہیں۔ روم نمبر 100 میں پتہ کیجئے"۔

"ارے ہمارا ایڈریس کارڈ بناؤ۔ میرا نام ڈاکٹر روبینہ ہے۔ میرے ہسبنڈ کو کاڈیک اٹیک ہوا ہے انہیں ICU میں پہنچائے"۔

"او کے۔ ڈاکٹر روبینہ" انکوائری میں بیٹھا ہوا ڈاکٹر اٹھا ہی تھا کہ سر پکڑ کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ مجھے کیا ہوا؟ میرا سر چکرا رہا ہے...... میں کیا کروں؟"

ادھر لوگوں کا ایک ہجوم ڈاکٹر کے خلاف شکایت کرنے کے لئے ایک مقامی اخبار کے دفتر پر پہنچے۔ دفتر بند پڑا تھا۔ ایک شخص نے وہاں موجود ایک پولیس والے سے پوچھا یہ

دفتر آج بند کیوں ہے؟ اس پولیس والے نے کہاں اس اخبار کے ایڈیٹر کو "بلیک میلنگ" کے جرم میں پکڑ کر لے گئے ہیں۔ ہجوم نزدیکی پولیس سٹیشن کی طرف مڑا تھانے کے گیٹ پر پہنچ کر ایک پولیس والے سے کہا۔ ہمیں ڈی ایس پی صاحب سے ملنا ہے۔ انہیں جا کر کہہ دو......کہ...... "جناب وہ آپ سے نہیں مل سکتے......!"

"وہ کیوں؟"

"کیونکہ ان کو سی بی آئی والے لے گئے ہیں۔ ان پر الزام ہے کہ وہ ایک جنسی سکینڈل میں ملوث ہیں"۔

"لیکن سکینڈ آفیسر ہوں گے!"

"نہیں جناب وہ بھی موجود نہیں ہیں۔ ان کے گھر سے فون آیا تھا کہ ان کی بیوی حوالدار کے ساتھ بھاگ گئی!"

"اوہ......پھر بھی آپ ہماری شکایت اپنے رجسٹر میں درج کر سکتے ہیں!"

"نہیں جناب تھانے کا محرر موجود نہیں۔ ان کا بیٹا نشیلی ادویات فروخت کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے!"

"اچھا کوئی تو ہوگا جس کے پاس ہم اپنی شکایت درج کروا سکتے ہیں!"

"جناب آپ کے لئے مناسب اور بہتر تھا کہ آپ صدر کمیٹی برائے اصلاح معاشرہ کے پاس اپنی شکایت درج کرتے......لیکن......"

"لیکن؟......لیکن کیا......؟"

"ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر اپنی بہو پر تیل چھڑک کر آگ لگانے کی کوشش کی ہے کہ بہو نے اُس کی فرمائش سے کم جہیز لایا تھا اور لوگوں نے اُسے اتنا پیٹا کہ اسے اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔

''اوہ......!''

اتنے میں ایک سفید پوش پولیس والے نے آکر دوسرے پولیس والے کے کام میں کہا۔

''یہی وہ شخص ہے جس کی شکایت ہمارے پاس آئی ہے کہ یہ کسی ایجنسی سے جلوس نکالنے کے لئے پانچ ہزار اور ایک روپیہ فی نعرہ کے حساب سے کیش لیتا ہے''۔
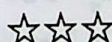
ٹھنڈے بدن کے رشتے

گزشتہ دس دنوں میں یہ ساتواں پوسٹ مارٹم تھا۔ قصبے کے واحد سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر سلمان کا موڈ دیکھ کر تھانے کے انچارج آفیسر غلام رسول نے کہا:

''میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ آپ کو پسند نہیں لیکن قانونی فارملٹیاں تو بہر حال پورا کرنا پڑتی ہیں''۔

ڈاکٹر سلمان کچھ نہ بولے...... خاموشی سے فارم بھرنے لگے۔ ''آج بھی باڈی کی شناخت نہیں ہو سکی؟''

''جی نہیں......اور شاید ہو گی بھی نہیں؟''

''وہ کیوں......؟ ڈاکٹر نے تھانے دار سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

جناب مقتولہ کا سر دھڑ کے ساتھ نہیں تھا۔ قرب و جوار میں بسیار تلاش کے بعد بھی نہ ملا۔ اس لئے......!''

''اوہ مائی گاڈ...... یہ باڈی عورت کی ہے اور وہ بھی سر کے بغیر؟''

ڈاکٹر سلمان نے سسٹر عائشہ کی طرف دیکھا۔ سسٹر باڈی کو روم میں لے جایئے۔ میں ابھی آتا ہوں......''

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر سلمان پورے تیار ہو کر پوسٹ مارٹم روم میں داخل ہوئے

۔سسٹر عائشہ پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر اپنی ٹیم کے ہمراہ ٹیبل کے ساتھ کھڑی تھی۔

باڈی کو سفید کپڑے سے ڈھانپا گیا تھا۔ڈاکٹر سلمان کے اسسٹنٹ دم بخود کھڑے تھے۔جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہوا! دراصل انکا سابقہ پہلی بار ایک بے سر کی لاش سے پڑا تھا اور وہ بھی ایک عورت کی...... "سسٹر آپ Exmin کریں کہ......!

"ڈاکٹر یہ بدنصیب لڑکی Pregnant ہے......اور اس کی باڈی پر تشدد کے نشانات بھی ہیں اور اس کا گینگ ر......"بس سسٹر بس! بٹ آر یو شور اباوٹ......"

"ڈاکٹر میں نے اس کا سرسری چیک کر لیا ہے۔آپ بھی......!"

"نہیں نہیں......آج یہ کام تم کرو......میں سائن کر دوں گا......!"

"ڈاکٹر......اگر فارملٹی ہی پوری کرنی ہے تو پھر......لیکن کہیں یہ ن انصافی تو نہیں ہو گی؟"

"دیکھو میرے سر میں بے حد درد ہو رہا ہے......میرا دل آج کچھ اُداس سا ہے...... دھڑکنیں تیز ہو رہی ہیں، پتہ نہیں کیا ہو گیا مجھے۔

مقامی تھانے کے انچارج غلام رسول نے جو ضمنی تحریر کی تھی وہ کچھ اس طرح تھی۔

"آج بعمل 22 بجے دن گاؤں نہال پور کے چند لوگ تھانے میں آئے اور مجھے اطلاع دی کہ جنگل سے ملحق ایک نالے میں ایک عورت کی بے سر کی لاش پڑی ہے......میں ...... کے ساتھ جائے واردات پر بمراد موقعہ ملاحظہ پہنچا اور باڈی کو اپنی تحویل میں چند تصویریں لینے کے بعد لے لیا۔یہ باڈی ایک نامعلوم خاتون کی ہے جس کی عمر ہمارے اندازے کے مطابق 20 سے 25 سال کے درمیان رہی ہو گی۔تفتیش سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون ہے اور اس کو کس نے یا کن لوگوں نے اس بے دردی اور سفاکی سے قتل کر دیا ہے۔

مقتولہ کی گردن کسی تیز دھار والے آہنی آلے سے کاٹی گئی ہے۔مقتولہ کے بدن پر تشدد کے گھاؤ بھی عیاں ہیں۔مقتولہ نیم عریاں حالت میں ملی۔ابتدائی چھان بین سے صرف اتنا پتہ چل سکا کہ مذکورہ نہال پوریا اس کے آس پاس کے کسی بھی گاؤں کی نہیں۔دیہاتی ذمہ دار لوگوں نے اپنے اپنے گاؤں میں پوری طرح سے چھان بین کر کے بتایا کہ اس علاقے کی سب عورتیں بہو بیٹیاں بالکل سلامت ہیں۔راقم الحروف نے کئی لوگوں خصوصاً خواتین سے سٹیٹ منٹ لئے کہ وہ اس واقعہ پر روشنی ڈالیں لیکن کسی نے بھی کچھ کہنے سے معذوری کا اظہار کیا۔علاقے کے لوگ اس بے رحمانہ قتل کے موجب بے حد دکھی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ اس قسم کا دلدوز سانحہ اس علاقے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا ہے۔لیکن ان کا اس معاملے سے کوئی لینا دینا نہیں۔خواتین نے روتے روتے بیان دیا کہ اس کا پتہ لگایا جائے کہ یہ عورت کہاں کی رہنے والی تھی اور اس کو کس نے قتل کیا؟ راقم بندہ نے علاقہ بھر کے لوگوں کو فہمائش کی ہے کہ وہ باڈی سے الگ کیا گیا' سر ڈھونڈنے میں پولیس کی مدد کریں۔ بندہ نے دوسرے تھانوں کے حکام سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ اپنے اپنے حدود میں تفتیش کریں کہ وہاں کسی عورت کی گمشدگی یا اغوا کا کوئی واقعہ پیش تو نہیں آیا؟'' تحقیقات جاری ہے......اور ضمنی فی الحال بند نہیں کی گئی ہے۔مزید انکشافات بعد از تفتیش متوقع ہیں جنہیں موزون وقت پر دستیاب ہونے سے بعد ضبط تحریر میں لا کر آگے کی کاروائی کی جائیگی''۔

ڈاکٹر سلمان نے گلوز پہن رکھے تھے......لیکن جونہی اس نے مقتولہ کی باڈی کو چھوا ......اسے محسوس ہوا کہ اس کے بدن میں برقی رو دوڑ گئی ہے۔استرا اس کے ہاتھ سے باڈی کے پیٹ پر جا گرا۔اس کا ہاتھ مقتولہ کی چھاتی کے محدود اُبھار سے جا ٹکرایا تھا۔اس نے سارے بدن میں سنسنی اور کپکپاہٹ سی محسوس کی۔''یا اللہ یہ مجھے کیا ہوا ہے۔اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔اس نے سسٹر عائشہ سے کہا''سسٹر مجھے سنبھالو......میں اس

لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں کر سکتا''۔

ڈاکٹر سلمان کے معاونین اور سسٹر عائشہ نے سلمان کو دوسرے روم میں لے کر ایک بیڈ پر لٹا دیا۔ سلمان نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن اسے محسوس ہوا کہ اسپتال کی چھت اُس کے اوپر گرنے والی ہے......اسے ہر شئے حرکت کرتی اور گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی......وہ کراہنے لگا۔

''آپ ذرا تھوڑی دیر کے لئے باہر آیئے''۔ تھانے دار غلام رسول نے سسٹر عائشہ سے کہا......

سسٹر تھانے دار کے ساتھ باہر آئی......

''دیکھئے' آپ ڈاکٹر صاحب کو پوسٹ مارٹم کرنے پر اصرار نہ کیجئے۔ آپ انہیں کسی طرح اپنے ساتھ سہارا دے کر باہر لائے اور میری گاڑی میں بٹھائے۔ باڈی کو ایمبولنس میں رکھوایئے۔ ہم جا رہے ہیں۔ ہمیں سیدھے ڈاکٹر سلمان کے گھر جانا ہوگا۔ اس باڈی کا ''سر'' مل گیا ہے اور یہ کوئی اور نہیں ڈاکٹر سلمان کی ......!'' عائشہ کی چیخ نکل گئی۔ سب دم بخود تھانے دار کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔

دھندلا آئینہ

نئی سڑک سے رتن رانی ہسپتال تک وہ پیدل چل کر جاتی تھی۔اس کے آگے وہ میونسپلٹی کے ایک چھکڑے کی فرنٹ سیٹ پر جا کر بیٹھ جاتی اور پھر چھکڑے کا انجن جس طرف ہوتا وہ اسی طرف اسے لے جاتا تھا اس چھکڑے کا ڈرائیور ایک سیاہ فام 40 سالہ شخص تھا جس کے ہونٹوں میں ہمیشہ سب سے سستے برانڈ کا ایک سگریٹ کبھی سلگا رہتا اور کبھی بجھا......! سہراب، مجید، بھوشن اور بشیر بلاوجہ روزانہ اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے اور زبردستی نقلی کھانسی کھانستے مجید کے ایل سہگل کا گیت اونچے سروں میں گاتا تو اس کے جواب میں سڑک کے کنارے کھڑا گدھا ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگتا......پھر تینوں دوست اس پر ہنستے ایک مرتبہ بھوشن نے فلمی انداز میں گانا شروع کیا......رُک جاؤ جانے والی رُک جا......بشیر کہتا......"میں ہوں راہی تیری منزل کا......ان سب میں سہراب کچھ کچھ بھلے مانس اور سیانا لگتا تھا۔وہ انہیں ٹوک کر کہتا......"بھائیو......تم ایک نہ ایک دن مجھے بھی اپنے ساتھ پٹواؤ گے......بھلا عشق جتلانے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔بھوشن نے سہراب کی بات سن کر منہ بنا کر کہا تم ہمارے ساتھ ہی پٹو گے تو اس میں حیرانگی کی کونسی بات ہے۔آخر تم کوئی فرشتے تو نہیں ہو۔اس مشترکہ معشوقہ کے چاہنے والوں میں سے تم بھی تو ایک ہو۔ورنہ تم ہمارے ساتھ ساتھ ہمیشہ کیوں چمٹے رہتے؟ اب رہا سوال عشق جتلانے کے طریقے کا......یار تم ہی کوئی طریقہ بتاؤ......تو ہم جانیں!"

''دیکھو عشق کے معاملے میں ہم سب اناڑی ہیں......اس لئے میرا خیال ہے کہ یا تو ہمیں اس نامعلوم محبوبہ کا پیچھا چھوڑنا ہوگا یا پھر......؟'' ''یا پھر کیا......!'' ''ہمیں جا کر ان کا ہاتھ تھام کر کہنا ہوگا کہ ہم......یعنی کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں......! یہی نا......؟'' ''اور ہم کہاں جائیں بشیر نے بھوشن کی بات ختم ہوتے ہیں سوال کیا؟''

ارے نہیں ......میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا بلکہ میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہمیں کسی ایسے تجربہ کار اور منجھے ہوئے عاشق سے تربیت لینا ہوگی اور پھر آگے بڑھنا ہوگا......!''

''سہراب! تم بھی بڑے بدھو ہو...... منجھے ہوئے عاشق اب اس دنیا میں نہیں مل پائیں گے انہیں ملنے کے لئے پہلے ہمیں مرنا پڑے گا......کیونکہ وہ مر چکے ہیں نامراد اور ناشاد بلکہ ناکام جیسے مجنوں' فرہاد' رانجھا' مہیوال' قیصر وغیرہ وغیرہ......!''

''ارے یار تم نے کبھی محسوس کیا کہ یہ لڑکی ہمیں بالکل کوئی لفٹ نہیں دیتی......!''

''ہاں ہاں ...... میں نے آج تک اس کے ہونٹوں پر ذرا سی مسکراہٹ بھی نہیں دیکھی''۔

''اور میں نے آج تک اُس کا چہرہ دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کی......''

''پھر ایک اور بات بھی ہے......! ہم ہیں چار......اور وہ ہے ایک! وہ بے چاری آخر کس کس کی مسکراہٹوں کا جواب دے گی۔ظاہر ہے کہ وہ ہم سب کے ساتھ محبت تو نہیں کرسکتی......اس کے دل میں صرف ہم میں سے ایک ہی سما سکتا ہے!''

''کیا اُس کا دل اتنا چھوٹا ہے؟'' بشیر نے پوچھا

''ابے دل پتہ ہے کتنا ہوتا ہے ایک مٹھی کے برابر......!'' بھوشن نے اپنی معلومات جتائی؟''

''ایک آدمی بھی سما نہیں سکتا......!''

''ابے اُلو یہ محاورتاً کہا جاتا ہے'' ......

باتیں کرتے کرتے وہ نور باغ پہنچ گئے اور جا کر عیدگاہ میں بیٹھ گئے جہاں چھٹی ہونے کی وجہ سے بہت سے لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔

''یار میرا خیال ہے کہ وہ جس چھکڑے میں بیٹھ جاتی ہے اس کا ڈرائیور اس کا کوئی یار وار ہوگا......!''

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس گلفام کا سیاہ فام فادرِ بزرگوار ہو......'' بھوشن نے انگریزی لفظ فادر کے ''ر'' کے نیچے ''زیر'' کی علامت کا استعمال کر کے اسے خوبصورت اُردو لفظ بنا دیا۔

مجید نے جیب سے دو روپے والی سگریٹ کی ڈبیہ نکالی جو اس وقت سب سے قیمتی سگریٹ مانا جاتا تھا اور ایک سگریٹ سلگا کر سہراب سے پوچھا ''تم کوئی اور نصیحت کرو بڑے بھائی......!''

بھوشن نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے مجید سے سگریٹ مانگی ''یار ایک کش مجھے بھی دینا......''

''ارے یہ منہ اور مسور کی دال ...... یہ قیمتی سگریٹ ہے اس کا دھواں بھی مفت میں نہیں ملتا......''

''ارے وہ دیکھو مولوی آرہا ہے ش......اسی سے کوئی ترکیب پوچھتے ہیں......!''

مولوی قریب آگیا تو بشیر نے آواز دی ''مولوی ذرا ادھر آؤ نا یار ہماری مدد کرو......!''

مولوی وہ سب اپنے ایک مشترکہ دوست ناظم کو کہتے تھے جس نے داڑھی رکھ لی تھی۔

ناظم آتے ہی میدان میں بیٹھ گیا تم چاروں اور یہاں یعنی عیدگاہ میں......!''

یار آج عید تو نہیں تم کیوں طعنے دیتے ہو؟ دراصل ہمیں ایک مسئلہ درپیش ہے''

سہراب نے سب دوستوں کی طرف دیکھا......!''

سبھوں نے سر جھکا لئے جس کا مطلب تھا کہ ''ہاں ہاں کہو......!''

اس کے بعد سہراب نے سارا قصہ اُسے سنا دیا۔

ناظم تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر داڑھی کھجلانے لگا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ آؤ چلو وہ تانگہ خالی آرہا ہے کرن نگر تک چلیں گے مجھے 4 بجے ڈاکٹر شمبو ناتھ کے پاس جانا ہے۔ راستے میں سوچ لیں گے۔

''یار ہمارے پاس تانگے کو دینے کے لئے کرایہ نہیں...... مجید نے کہا

''لیکن تم تو بہت مہنگے سگریٹ پیتے ہو......! یہ روپے کہاں سے لاتے ہو......؟''

''یار یہ سگریٹ پیکٹ میں نے بڑے بھائی کے جیب سے چرالی ہے۔ تم سے کیا چھپاؤں؟''

سب ہنسنے لگے اور مولوی نے تانگہ روکتے ہوئے کہا ''تم سب کا کرایہ میں دوں گا آؤ بیٹھو''

کرن نگر پہنچ کر مولوی شمبو ناتھ کے کلنک میں گھس گیا اور باقی سارے دوست باہر فٹ پاتھ پر بیٹھ گئے۔

ارے وہ مارا...... ''وہ دیکھو......اُدھر'' وہ جارہی ہے؟'' بھوشن شمبو ناتھ کے کلنک کی طرف لپکا لیکن مولوی باہر آرہا تھا...... انہوں نے مولوی سے کہا ''وہ ہے......وہ ہے......تم نے کیا سوچا ہے؟'' جلدی کہو......

''ٹھہرو......'' مولوی اس کے پیچھے ہولیا اور گول مارکیٹ کے قریب اُسے جالیا......

وہ دونوں وہاں کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہے۔ ادھر چاروں دوستوں کی چھاتیوں پر سانپ لوٹ رہے تھے......اس کے بعد وہ دونوں مڑے اور ان چاروں کی

طرف چل پڑے۔

''جل تو جلال تو......''

''آئی بلا کو ٹال تو......''

''یار میرا خیال ہے کہ یہ لڑکی کہیں مولوی......؟''

''آ گئے ......'' آؤ'' مولوی نے کہا......سب خاموش چہرے لٹکائے مولوی اور لڑکی کے پیچھے پیچھے چل پڑے......اور آ کر گول باغ میں بیٹھ گئے۔

''تم خود ان سے کہو کیا کہنا چاہتی ہو......؟''

وہ لڑکی ایک انگلی سے زمین کریدتے ہوئے بولی ''میں گزشتہ ایک ماہ سے دیکھ رہی ہوں کہ یہ بھائی صاحبان میرا پیچھا کرتے رہتے ہیں اور کبھی گانا گاتے ہیں' کبھی سیٹیاں بجاتے ہیں بس!''

نہ میں نے کبھی ان کا سامنا کرنے کی کوشش کی اور نہ ان بھائیوں نے مجھے کبھی کچھ کہا......!''

میں نے اندازہ لگالیا کہ یہ لوفر اور لفنگے نہیں بلکہ اچھے گھروں کے بچے ہیں اسی لئے یہ گانے کی حد سے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر سکتے ......یہی نہیں بہت سے اور لوگ بھی مجھے دیکھ کر فقرے کستے رہتے ہیں بلکہ ایک آدھ بار انہوں نے میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش بھی کی۔ہم شریف لوگ ہیں اگر ہم شور بھی مچائیں تو الٹی ہماری ہی بدنامی ہوگی۔چھکڑے کا ڈرائیور میرا باپ ہے اور ہم ''شیخ'' ہیں اگر آپ میں سے کوئی میرے ساتھ شادی کرنے کے لئے تیار ہے تو پھر میں بھی تیار ہوں۔میں باپ سے پوچھ لوں گی۔مجھے کل تک جواب دینا کیونکہ وہ چھکڑا آ گیا ہے اور ہارن بجا کر میرا باپ مجھے بلا رہا ہے......!خدا حافظ!

☆☆☆

C for Cute

سی فار...... کیوٹ

خواجہ صاحب کے خوبصورت لان میں بچوں کی دل بہلائی اور کھیل کود کیلئے ہر وہ چیز موجود تھی جو 2 سال سے 17/18 سال کے بچوں کی دلچسپی کا باعث بن سکتی تھی۔ مثلاً ''اپ اینڈ ڈاؤن'' ''بیڈمنٹن کوٹ'' ''منی ٹائی ٹرین'' ''کیرم بورڈ'' ''شوٹنگ بٹ وغیرہ۔ خواجہ صاحب کے تو اپنے 6 چاند اور لعل تھے اور وہ دومنیاں۔ ان کی عمریں 5 سال سے 20 سال کے درمیان تھیں۔ 5 سال کا ہارون اور 20 سال کی صائقہ اور بیچ کی کہکشاں اور ''دُب اکبر'' کے ستارے سب بچوں میں گنے جاتے تھے یہ الگ بات ہے کہ یہی ''بچے'' اگر کسی غریب کی کٹیا میں پیدا ہوئے ہوتے تو انہیں سب ''مرد اور عورتیں'' کہتے اور سچی بات بھی یہی ہے کہ پتہ نہیں غریب ماں باپ کی اولادیں کیوں اتنی تیزی سے بالغ ہو جاتی ہے اور پھر اپنے ناموں کی نسبت سے وہ بچپن ہی میں مختلف کاموں سے وابستہ ہو جاتے ہیں مثلاً ''گلو کے بڑے بیٹے'' ''سلطان'' کو ایک پیر صاحب اس وقت کام کرنے کے لئے لے گئے جب ''سلطان'' صرف 7 سال کا تھا اور آج سلطان 20 سال کا ایک وجیہ اور خوبرو نوجوان ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پیر صاحب کے ''گھوڑے'' کی خدمت میں شب و روز مگن ہے اور ادھر خواجہ صاحب کی سب سے بڑی اولاد ''صایقہ'' وومن کالج میں سیکنڈ ائیر کی طالبہ ہے اور دن رات مطالعے اور سخت محنت سے وہ مچھر دانی کی ''چھڑ'' جیسی لگتی ہے

اور جب وہ لان میں ''چہل قدمی'' کرنے نکلتی ہے تو لگتا ہے کہ ہوا کے جھونکے سے گرنے والی ہے۔ دوسری منی' صبا ہے......جس کی آنکھیں نیلی سبز ہیں۔ اس کی عمر شال صاحب کے بوڑھے کتے کے برابر ہے......وہ چلتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ بطخ تالاب کے گرد چکر لگا رہی ہے اور پانی میں پرواز کرنے کے لئے پر تول رہی ہے۔

''گلو'' کا اصلی نام غلام قادر ہے۔ کچھ لوگ اسے قادر شیخ بھی کہتے ہیں۔ قادر عرف گلو خواجہ صاحب کا سب سے نزدیک ہمسایہ ہے۔ اس کا گھر خواجہ صاحب کے بنگلے کے عقب میں نزول کی زمین میں بنا ہے اور گلو نے متعلقہ حکام کو اپنی دس سال کی جمع پونجی دے کر ساڑھے تین مرلے اپنے نام کروالئے۔ محلے والوں میں سے کسی نے گلو کے مکان پر اعتراض نہ کیا بلکہ اسے ہر ممکن مدد دی۔ دراصل یہ گلو کی نیک خصلت شرافت' دیانت داری' محنت اور اعلیٰ صفات کا نتیجہ تھا۔ اسے محلے کا ہر شخص پسند کرتا تھا۔ غلام قادر شیخ عرف گلو گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ چالیس سال پہلے شہر میں آیا کرتا تھا اور لوگوں کو لکڑیاں پھاڑ کر دیتا تھا۔ اس لئے اسے ابتداء میں قادر تبردار کہتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ خواجہ صاحب کے گھر میں ملازم ہو گیا۔ اس کی محنت اور دیانت داری سے متاثر ہو کر خواجہ صاحب نے اسے پھر کہیں نہ جانے دیا۔ وہ خواجہ صاحب کے گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے وہاں رہنے لگا۔ ابتداء میں خواجہ صاحب نے اسے اپنے مکان کے ایک کمرے میں ٹھہرایا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی شہر آ گئے تھے۔ وہ بھی خواجہ صاحب کے گھر ہی میں کام کرتے تھے لیکن اس کا بڑا لڑکا سلطان عام طور پر گاؤں ہی میں رہتا تھا اور ماموں کے کاموں میں اُن کا ہاتھ بٹاتا تھا اور پھر پیر صاحب نے اسے گلو سے مانگ لیا۔

خواجہ صاحب اور گلو افزائش اولاد مین برابر برابر چل رہے تھے۔ ایک دن خواجہ صاحب نے اسے ''ڈرتے ڈرتے'' کہا ''گلو'' تم ''فیملی پلاننگ'' کروالو۔ دیکھو ناراض نہ

ہونا میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تمہاری آمدنی قلیل ہے اور تمہاری بیوی بیمار رہتی ہے۔ میری بات اور ہے۔ میں موجودہ اولادوں سے ڈبل بچوں کی پرورش بھی احسن طریقے سے کر سکتا ہوں۔ گلو نے سر جھکا کر کہا ''امام صاحب کہتے تھے کہ جو شخص محض رزق کی وجہ سے اپنی اولاد......''

گلو کا دوسرا بڑا لڑکا ''بادشاہ'' خواجہ صاحب کے حقہ پر مامور تھا وہ حقے کیلئے انگارے تیار کرتا، بازار سے تمبا کو لاتا۔ حقے میں پانی بھرتا اسے تازہ کرتا۔ پھر دو چار کش خود کھینچ کر حقہ جمالیتا اور پھر نیچہ خواجہ صاحب کی طرف موڑ کر کہتا ''پیجئے جناب'' خواجہ صاحب نلچہ بادشاہ سے لیکر ہونٹ سکوڑتے اور بڑی نزاکت سے ہلکے ہلکے کش لگاتے اور دھویں کے مرغولوں کے بیچ سے وہ ''بادشاہ'' کو دیکھتے۔ ''ایک معصوم لڑکا ''بادشاہ'' کیا نام رکھا ہے۔ باپ نے۔ اچھا نام ہے! گلو کی نظروں میں تو وہ واقعی بادشاہ ہے لیکن حقیقت میں وہ ''بادشاہ'' نہیں۔

خواجہ صاحب بڑبڑاتے۔ خود اپنے آپ سے باتیں کرتے اور بادشاہ معصوم نگاہوں سے اپنے مالک کو...... دیکھتا...... ایک دن گلو نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ جوڑ کر خواجہ صاحب سے عرض کی ''گستاخی معاف'' ''چھوٹی بی بی صبا، بادشاہ کو قاعدہ پڑھالیتی تو ہمارا سارا خاندان قیامت تک اپ کا احساس مندر رہتا''۔

''ایں......؟ ارے واہ...... یہ خیال تمہارے اس موٹے سر میں پہلے کیوں نہیں آیا؟ بھئی یہ تو بہت اچھی تجویز ہے آخر بادشاہ بھی تو ہمارا ہی بچہ ہے!''

''جی یہ آپ کا بڑا پن ہے۔ دراصل ہماری سات پیڑیوں نے کبھی لکھنے پڑھنے کی طرف توجہ نہیں دی ہے لیکن اب تو زمانہ ہی ایسا آ گیا ہے کہ......''

''ارے ٹھیک ہے قادر! تم ذرا حقے کیلئے دو تین دانے انگارے تیار کر لو۔ یہ

لوکانگڑی......"۔

اگلے دن جب خواجہ صاحب گھر آئے تو ان کے ہاتھ میں اردو کا قاعدہ اور ایک انگریزی پرائمر تھے انہوں نے بادشاہ کو بلا کر کتابیں اسے دیں اور پھر صبا کو ہدایت کی کہ وہ آج ہی سے بادشاہ کی پڑھائی کی بسم اللہ کرے۔

بادشاہ نے چلم میں تمبا کو بھرا پھر دہکتے ہوئے کوئلے اس کے اوپر رکھے اور دو کش کھینچ کر حقہ خواجہ صاحب کے سامنے رکھ دیا اور پھر ملحقہ کمرے میں جہاں بچے لکھنے پڑھتے ہیں میں جا کر صبا کے آگے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

"صبا نے بادشاہ کی طرف دیکھ کر پہلے ناک مروڑی پھر قاعدہ کھول کر اس کی طرف کر دیا "پڑھو" ......اس نے انگلی "الف" کے اوپر رکھ دی "الف" "انار" بادشاہ بولا۔آگے پڑھو "ب" "بلی" اس نے صبا کی طرف دیکھا دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔صبا نے پلکیں جھکائیں ...... "کیا کہا......؟" "بلی!" "نہیں ...... بلی نہیں بے "بطخ"۔اسے نہ جانے کیوں کھانسی آگئی پھر دہرایا بب بب...... "بطخ" یعنی کہ......!"

"پہلے بولو......تم نے مجھے بلی کیوں کہا؟" صبا نے اکڑ کر پوچھا...... "میں نے ......؟بس یونہی نکل گیا زبان سے......!"

"میں خوب سمجھتی ہوں ......تم نے پلے بھی ایک مرتبہ علی سے کہا تھا کہ "میری آنکھیں بلی جیسی ہیں نیلی سبز......تم آخر مجھے کیا سمجھتے ہو؟"

"بی بی ......" اس کے علاوہ کچھ نہیں ...... "اچھا آگے پڑھو!" "پ" پنکھا ...... "ت" تتلی "ٹ" ٹماٹر......!" "بس بس یہ ٹھیک ہے......تم تو یہ خود پڑھ لیتے ہو...... میں کیا پڑھاؤں" وہ کیا ہے بی بی جی کہ جب ہاشم، عامر، علی، مینا اور نیلو قاعدہ پڑھتے تھے تو مجھے بھی یاد ہو جاتا تھا......" "اچھا صبا نے چہک کر کہا اب ذرا انگریزی کتاب نکالو......پھر

اس نے ''A'' اسے کے اوپر انگلی رکھ کر پوچھا...... ''یہ کیا ہے''؟ ''اے فار ایپل'' بی فار بلی' بلی نہیں بطخ...... جی یہ بطخ نہیں '' بکٹ'' بولو بی فار بکٹ'' ...... ''جج جج جی......!'' ''اور بولو تم نے پھر ''بلی'' کیوں کہا؟'' ''غلطی ہوگئی...... اب پھر کبھی نہیں بولوں گا......!'' ''اچھا یہ پڑھو...... ''سی فار کیٹ'' ''کیا کہا...... ''کیٹ؟''

''نہیں بی بی جی...... کیٹ نہیں...... پھر غلطی ہوگئی......!'' ''سی فار کیوٹ......'' صبا نے مسکراتے ہوئے بادشاہ کے معصوم سے چہرے پر نگاہیں گاڑھ کر کہا......'' ''کیوٹ...... یو آر سو کیوٹ کنگ......''۔

پاگل خانہ

اس عظیم قدیم خوبصورت عمارت میں داخل ہونے کے لئے کئی دروازے تھے جو سب کے سب مقفل تھے۔ صرف ایک صدر دروازہ ہی کھلا رہتا تھا۔ ہر دروازے پر مسلح پہرے دار ڈیوٹی دے رہے تھے۔ لیکن صدر دروازے پر مسلح وردی پوش افراد کی ایک بھیڑ سی لگی رہتی تھی۔ ہر آنے جانے والے کی جامہ تلاشی لی جاتی۔ سامان کی بھی زبردست تلاشی لی جاتی۔ صدر دروازے پر ایک بہت بڑا سائن بورڈ لگا ہوتا جس پر جلی حروف میں اردو، انگریزی اور ہندی میں لکھا تھا "جنت" خوش آمدید، ویلکم، سواگتم۔ خدا آپ کو جنت نصیب کرے"۔ پڑھے لکھے لوگ داخلے سے پہلے یہ سب کچھ پڑھتے لیکن آخری سطر پڑھ کر اُن کا موڈ خراب ہو جاتا تھا اور غالباً آخری بار پیچھے مڑ کر دیکھتے اور "جنت" میں داخل ہو جاتے۔

یہ "جنت" اصل میں ایک بہت بڑے "مینٹل ہاسپٹل" کا نام رکھا گیا تھا۔ جس میں بظاہر نارمل قسم کے انسان گھومتے پھرتے نظر آتے۔ ہم نے "پاگل خانے" کے ریسیپشن انچارج سے یہی سوال کیا کہ یہاں تو کوئی بھی شخص پاگل نہیں لگتا پھر......؟" استقبالیہ کونٹر پر بیٹھے ہوئے شخص نے مجھے گھور کر دیکھا "تم کیا سمجھتے ہو یہ پاگل خانہ ہے؟" یہ جنت ہے اور میں جنت کا داروغہ ہوں کہ تمہیں کس سے ملنا ہے؟"

"جناب میں نفسیات کا ایک طالب علم ہوں اور کسی نے کہا کہ یہ نفسیاتی بیماروں کی پناہ گاہ ہے۔ کیا میں چند گھنٹے یا ایک دو دن اس نگری میں گزار سکتا ہوں۔؟"

"......ہاں ہاں کیوں نہیں......ایک دو دن کیوں ایک دو سال یا پھر چاہو تو ساری عمر یہاں گزار سکتے ہو۔ ہم تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں......!"

"جی دراصل میں اس موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہا ہوں......!"

"اچھا......؟ تو بڑی خوشی ہوئی، اسکا مطلب یہ ہے کہ آپ بھی بہت جلد اس سوسائٹی کے ممبر بننے والے ہیں۔ یہاں بہت سارے ڈاکٹر آف فلاسفی کرنے کے بعد ہی تشریف لائے ہیں اور آج کل ہمارے ڈاکٹر اُن کا ذہنی علاج کر رہے ہیں!"

میرے پیچھے "جنت کے جنونیوں" کی کیو لگی تھی۔ اس لئے میں نے اپنا گیٹ پاس لیا اور جونہی اندر داخل ہونے کے لئے اپنا قدم آگے بڑھایا آگے سے ایک باوردی مسلح پولیس والا آتا دکھائی دیا......اس نے مجھے سر سے پیروں تک اور پھر پیروں سے سر تک دیکھا پھر گویا ہوا "کیا تم پاگل ہو یا پھر اپنے کسی پاگل دوست یا رشتہ دار سے ملنے آئے ہو؟"

"ہاں میں تم سے ملنے آیا تھا۔ سنا ہے کہ تم نے آج چھ "جنونیوں" کو کاٹا ہے......!"

"بھوں بھوں......وہ بھونکنے لگا پھر بولا "کیا سمجھے......بھوں بھوں کا مطلب؟ ہاں یا نہیں......" "ہاں......! میں نے جواب دیا......پھر ٹھیک سمجھے......اب ساتویں کو کاٹوں گا۔ یہ کہہ کر وہ بھوں بھوں کرتا ہوا میری طرف لپکا......" میں دوڑ کر ایک پوسٹ کے اندر گھس گیا۔ پوسٹ کے اندر ایک خارش زدہ کُتا اپنا سر ٹانگوں میں دبائے محوخواب تھا۔ وہ بڑبڑا کر کھڑا ہو گیا......اور باہر لپکا......میں دوسری طرف سے ایک راہ داری پر جا نکلا۔ مریل مخمور کُتا میرے پیچھے آنے والے شخص کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا۔

اُس کے آگے کی دنیا بہت وسیع و عریض تھی۔ جو چیزیں یہاں قدرت نے بنائی

تھیں وہ بہت خوبصورت اور دلربا تھیں اور جو انسانوں کی بنائی ہوئی تھیں۔ وہ میں نے دیکھی تو سہی لیکن زیادہ انہماک اور دلچسپی سے نہیں۔ عمارت میں لاتعداد کمرے تھے اور سینکڑوں مردوزن بچے وہاں کسی کسی صورت میں موجود تھے۔ کچھ کھڑے تھے کچھ پڑے یا لیٹے اور کچھ چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ ہر ایک کے چہرے کو دیکھنا تو محال تھا پھر بھی جن چہروں پر نظر پڑی ہوئیاں اُڑتی دکھائی دیں۔ آنکھوں میں ویرانیاں' ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑیاں' رنگت پیلی زرد اکثر کی داڑھیاں بڑھی ہوئی۔ بے ترتیب بکھرے بال ادھیڑبن میں دوڑتے پھرتے جسم جیسے سب کو کوئی جلدی آن پڑی ہو۔ جیسے سبھوں کے باپ اج ہی مر گئے ہوں اور ابھی ابھی خبر سنی ہو۔ اُدھر دیکھئے دو ڈاکٹر صاحب سفید ایپرن پہنے کہیں دوڑے جارہے ہیں۔ دونوں کے لبوں میں پھنسے ہوئے سگریٹوں سے دھواں اس طرح نکل رہا ہے جیسے ٹرین دارجلنگ کے چائے کے باغوں میں بل کھاتی ہوئی جارہی ہے۔ تھوڑا سا آگے بڑھا تو کچھ خواتین اپنے بال کھولے ایک دائرے بنائے ہوئے بیٹھی ہیں۔ دوسری طرف سے دو پولیس والے آرہے ہیں اُن کے لبوں پر زہریلی سی مسکراہٹ دیکھ کر یہ عورتیں چیختی چلاتی "نہیں نہیں" کہتی ہوئی ایک اور دروازے سے اندر بھاگ جاتی ہیں اور اندر سے دروازے بند کردیتی ہیں۔ "آیا وہ......؟" ایک نے مجھ سے پوچھا...... "کون" میں نے کہا۔

"ارے تم کو نہیں معلوم" "وزیر داخلہ آرہے ہیں......؟" "اچھا......؟ لیکن مجھے کیا......؟"

اتنے میں کئی پولیس والے دوڑتے ہوئے آئے اور اس ہال نما کمرے کی طرف بڑھے جس میں کئی لوگ بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ "تاش" کھیل رہے تھے کچھ سر کے بل کھڑے کچھ گارہے تھے کچھ کپڑے اتار کر منہ اوپر کی طرف کر کے لیٹے تھے دو تین کھڑکیوں کی سلاخوں کو پکڑ کر کھڑے باہر دیکھ رہے تھے۔ جو پولیس والے دوڑ کر ہال کی جانب آئے

تھے ان کے پیچھے بہت سے لوگ آ رہے تھے اُن میں سے ایک شخص لیڈروں کا جیسا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اُسے دیکھ کر کھڑکی پر کھڑا ایک پاگل تالیاں بجانے لگا ''آ گیا......آ گیا ......آ گیا...... یہ کسی بڑے گھر کا لگتا ہے۔ واہ کیا ٹھاٹھ سے چل رہا ہے۔ جیسے یہ اُس کے باپ کا گھر ہو......دو چار دن رہے گا تو سب ہیکڑی نکل جائے گی......!'' مجھے ایک پولیس والے نے اپنے بانس کے ڈنڈے سے دھکا دیتے ہوئے کہا ''پیچھے رہو......اندھے پاگل ......دیکھتے نہیں ہو کون آ رہا ہے......'' بہت بڑا پاگل......!'' سلاخوں والے پاگل نے میری طرف سے جواب دیا ''سالا خطرناک لگتا......اتنی ساری پلس نے پکڑ کر لایا ہے''۔

لیڈر آ کر اُسی کھڑکی کے پاس رک گیا...... ''ہیلو......کیا حال......؟'' اُس نے کھڑکی والے پاگل سے پوچھا......میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک نہیں چاہتا ہوں' یہ کہہ کر وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگا......ایک پولیس آفیسر آگے بڑھا اور پاگل سے کہنے لگا '' بکو مت...... پاگل کہیں کے......بدتمیز......!''

''تم کون ہو......پاگل نے لیڈر سے پوچھا......''

''میں ہوم منسٹر ہوں۔ سمجھتے ہو ہوم منسٹر کسے کہتے ہیں؟''

''ہاہاہا......ہاہاہا......ہوم منسٹر......ارے میں بھی یہی کہتا تھا اور مجھے بھی یہی پلس والے پکڑ کر لائے تھے۔ ہاہاہا......تم ہوم منسٹر ہو تو میں چیف منسٹر ہوں۔ ہاہاہا...... چیف منسٹر......؟''

دیکھو تم لوگوں کو کوئی تکلیف تو نہیں......؟''

''ہم لوگوں کو تو تکلیف تو نہیں مگر تم کیا تکلیف ہے۔ کیا تم ہمیں تکلیف دینے کے لئے آئے وہ......جن کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی اُنہیں تم تکلیف پہنچاتے ہو......!'' مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ ایک حوالدار نے ڈنڈا میری پشت پر مارتے ہوئے کہا۔ سالا تم بھی ہنستا ہے

...... بھاگو یہاں سے......!'' میں بھاگتا ہوا جونہی آگے بڑھا تو شور چیخیں اور گالی گلوچ سن کر رک گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آگے سفید لباسوں اور ٹوپیوں اور پگڑیوں میں ملبوس نورانی چہرے والے باریش بزرگ اور نوجوان ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں ۔ ایک نے دوسرے کا گریبان پکڑ رکھا ہے اور دوسرے نے پہلے کی داڑھی۔ ہر ایک کے منہ سے گالیوں کے ساتھ ساتھ جھاگ بھی بہہ رہی ہے۔ میں نے قریب کھڑے ایک پریس فوٹو گرافر سے پوچھا' بھائی یہ کون لوگ ہیں اور سبب ان کے دست وگریباں ہونے کا کیا ہے؟''

اس صحافی نے میری طرف دیکھا۔ یہ ہمارے مذہبی رہنما ہیں۔ بے چارے مسلکی جھگڑوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ لیکن اس ''جنت'' میں یہ کیا کر رہے ہیں......!''

''دراصل یہ اِسی دنیا کے باسی ہیں...... جیسے ہم تم لیکن یہ اپنے آپ کو ہم سے افضل اور برتر سمجھتے ہیں۔ اسی لئے مینٹل ہاسپٹل کی انتظامیہ نے انہیں ''سپیشل کلاس'' دے رکھی ہے اور یہ لوگ اب کسی بھی طبی علاج یا Treatment سے بالاتر ہیں۔ جسے اس ہسپتال سے باہر کے لوگوں Hopless یا ''علاج کہتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ان لوگوں نے اپنی عبادت گاہیں الگ الگ بنا رکھی ہیں۔ جہاں یہ عبادتوں کے بعد ایک دوسرے کو صلواتیں سناتے ہیں اور پھر باہر نکل کر اللہ کی راہ میں ایک دوسرے کا خون بہانے کو اعلیٰ عبادت سمجھ رہے ہیں۔ عام لوگ حیران و پریشان کبھی ادھر کبھی اُدھر دوڑتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص جو لہولہان تھا ہمارے سامنے سے یہ شعر گنگناتا ہوا گزرا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ نہ ادھر کے رہے۔ دوسرا شخص جو ایک گیسو دراز چاک گریباں شاعر تھا بہ آواز بلند کہتا ہوا سامنے سے گزر گیا۔

میری عبادتوں کا لطف مسلکوں میں بٹ گیا
جو مستند امام تھے وہ منبروں پہ سو گئے

ایک درویش نما شخص آ کر کہنے لگا...... "میں یوسف ہوں۔ یوسف ثانی...... یوسف زماں......شاہ مصر...... مجھے بدلہ لینا ہے۔ اپنے بھائیوں سے میں ابھی ابھی "چاہ" سے نکل کر آیا ہوں۔ لوگو...... میں کئی مرتبہ بیچا گیا ہوں۔ تمہارے شہر میں مجھے کسی بڑھیا نے نہیں بلکہ خرومندوں نے مجھے ایک دانہ گندم کے عوض بیچا ہے۔ میں بک چکا ہوں۔ میں غلام ہوں میرے پاس کچھ نہیں، صرف خودی ہے، خود پسندی ہے، خودستائشگی ہے لیکن کسی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میری "رضائی" کہاں ہے......!"

"بے چارہ......فوٹو جرنلسٹ کے منہ سے صرف ایک ہی لفظ نکلا......اس نے اس شخص کی تصویر بھی بنا ڈالی...... "یوسف ثانی" ہونہہ...... کہہ کر وہ جونہی دوسری طرف مڑا تھا میں نے کہا اپنا وزٹنگ کارڈ"! اور اس نے چپکے سے اپنا کارڈ میرے حوالے کیا اور آگے چل دیا۔ اس پر لکھا تھا "فرسٹریشن نیوز......" اس جنت کی غلام گردشیں بڑی خوبصورت تھیں ......اب میں اس غلام گردش پر چل رہا تھا جو ایک کھلے میدان کی طرف جارہی تھی اس میدان میں کئی سٹال لگے تھے اور ہر سٹال پر درجنوں لوگ موجود تھے۔ میں دیکھ کر اپنی ہنسی نہ روک سکا کہ پنڈالوں کے آگے کھڑے لوگ ہر پنڈال اور سٹال پر جا کر زندہ اور زندہ باد کہہ رہے تھے میں نے "زندہ باد" کہنے والے ایک "مردہ باد" قسم کے شخص سے پوچھا بھائی یہ کیا قصہ ہے یہی لوگ ہر پنڈال پر جا کر نعرے لگا رہے ہیں۔ آخر یہ کس کے ساتھ ہیں؟"

وہ مردہ نما شخص رک کر کہنے لگا لگتا ہے کہ تم اس پاگل خانے میں نئے نئے آئے ہو۔ ارے یہاں "زندہ باد" کہنے والے کو فی زندہ باد 10 روپے ملتے ہیں۔ اگر وہ دن میں 1000 مرتبہ زندہ باد کہے گا تو حساب لگا لو کہ کتنے روپے بن گئے۔ بے روزگاری حد سے آگے بڑھ چکی ہے۔ یہ سودا مہنگا تو نہیں۔ کوئی جسمانی مشقت نہیں کرنی، صرف منہ میں زبان ہلانی بازو ہوا میں لہرانا ہے۔ میری مانو تو تم بھی دس بیس نعرے لگا لو اور ادھر ہر سٹال

کے آگے ایک گماشتہ کرسی پر بیٹھا ہے۔ وہ معاضہ دینے والا کلرک ہے۔ جاؤ جلدی کرو......!" اس سے پہلے کہ وہ شخص آگے بڑھ جاتا میں نے اُسے روک لیا "بھائی صاحب میرے صرف ایک سوال کا جواب دیجئے۔ بس پھر جایئے کہاں جانا ہے؟

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ جلدی پوچھو۔ میرا نقصان ہو رہا ہے؟"

"یہ بتایئے کہ جن لوگوں نے یہ دکانیں سجا رکھی ہیں "جن دکانوں میں صرف باتیں بکتی ہیں وعدے بکتے ہیں دھوکے اور فریب بکتے ہیں انہیں اس تجارت سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟"۔

"ارے واہ تم تو نرے پاگل ہو......ارے ان کی روزی روٹی تو اسی دھندے سے چلتی ہے وہ ہمیں دیتے تو کچھ نہیں صرف ایک "زندہ باد" کے دس روپے لیکن اس "زندہ باد" سے وہ لاکھوں روپے کما لیتے ہیں۔ جو فنڈنگ ایجنسیاں انہیں مالی معاونت کرتی ہیں وہ اسی بنیاد پر کرتی ہیں کہ انہوں نے کسی نہ کسی طرح ہم آپ جیسے پاگلوں کو مصروف رکھا ہے۔ ان سٹالوں پر جو بینر لٹک رہے تھے اُن پر لکھا تھا...... یہاں پر عزی اور فرزی کو ملتی ہے دوسرے بینر پر لکھا تھا "یہاں خود اختیاری کا حق ملتا ہے......" تیسرے بینر کی تحریر ملاحظہ فرمایئے" آپ ہمارا ساتھ دیجئے ہم آپ کو آزادی دیں گے" اگلے بینر پر لکھا تھا" آیئے ہمارے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیجئے۔ ہم آپ کو خوش حالی دیں گے"۔ ایک سبز رنگ کے بینر پر لکھا ہے" داخلی خودمختاری خوداختیاری" ایک سرخ پرچم پر درانتی اور ہتھوڑے کی تصویر کے نیچے لکھا ہے" دنیا بھر کے محنت کشو۔ مزدور واور کسانو ایک ہو جاؤ" تھوڑی دیر پہلے جو مزدور اور محنت کش وہاں سرخ انقلاب کے نعرے لگا رہے تھے وہ اب اس گرین بینر کے نیچے آئے تھے جس پر دو تاریخ کا ہلال چپکایا گیا تھا......ان خالی خولی سٹالوں کے پیچھے ایک بڑا مارکیٹ لگا تھا۔ اس مارکیٹ میں "مردہ دلوں" کا ایک ہجوم اُمڈ پڑا تھا جو "زندہ دلوں" سے دل کو گرمانے اور

جذبات کو اکسانے والے کیسٹ اور سی ڈی خرید رہے تھے۔ بھائی ......بہنیں‘ بیٹیاں‘ موسیاں‘ چچے‘ تایے‘ دادے‘ نانے سب اپنی اپنی پسند کے گانے سنتے اور سر دھنے......اس مارکیٹ کے بغل میں کھانے پینے کی چیزیں بک رہی تھیں......سری پائے۔ کباب و کانتی‘ فرائی فش‘ حلوہ پراٹھے......قریب ہی تین بیت الخلاء بھی تھے اور کوڑا کرکٹ اور گوبر کے ڈھیر۔ عفونت اور بدبو سے قے آنے کا خطرہ تھے کروڑوں مکھیاں اور مچھر بھنبھنا رہے تھے اور کئی بزرگ جنہیں جوڑوں کے درد کی شکایت رہی ہے سری پائے اور لوا س تناول فرما رہے تھے۔ بھلے مانسوں کی ایک بھیڑ سی لگی ہوئی تھی۔ اچانک آگے سے کچھ لوگ بھاگتے ہوئے نظر آئے ”بھاگو۔ جان بچاؤ یہاں بم ہے ...... بھاگو......!“ ہم بھی بھاگے۔ اخبار فرسٹریشن کا کیمرہ مین بھی بھاگا لیکن کچھ نہ ہوا ایک نرس نے بتایا کہ ”کتوں نے سونگھ کر بم تلاش کیا۔ پولیس نے اُسے ناکارہ بنا دیا۔

”فرسٹریشن کا کیمرہ مین ...... میرے آگے آگے تھا......ہم لوگ ایک کمرے میں داخل ہوئے وہاں اندھیرا تھا۔ ایک کونے میں ایک شمع روشن تھی۔ ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ قطار میں کچھ لاشیں کفن اوڑھ کر رکھی گئی ہیں اور کچھ مرد اور خواتین وہاں کھانا کھا رہے ہیں۔ ہم نے اُن سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور آپ کون ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہاں پاگلوں کی لڑائی ہو گئی تھی اور دونوں طرف کے کئی پاگل مر گئے۔ ان میں ہمارے عزیز و اقارب بھی ہیں اور ہم اُن کے لواحقین ہیں۔ پہلے ہمیں کھانا کھانے دیجئے پھر ہم تفصیل بتائیں گے۔ ”فرسٹریشن“ کا کیمرہ مین تصویریں اُتار رہا تھا ”ونڈرفل“ دیکھئے کیا خوب کھانا ہے۔ پورا اوازہ وان ہے......!“ اتنے میں باہر سے شہنائی کی آواز سنائی دی اور پھر ”ونہ ون“ مدھر آوازیں بھی آرہی تھیں......ہم نے باہر نکل کر ایک شخص سے پوچھا ”یہ کیسا جلوس ہے؟“ اس نے کہا شادی ہے......! دلہا دلہن لینے جا رہا ہے۔ امیر لوگ ہیں گھر میں 10 کوئنٹل

گوشت پکا تھا۔ کہتے ہیں کہ دلہن والوں نے بیس کوئنٹل پکایا ہے۔ جہاں سے وہ گزر رہے تھے وہ کسی بزرگ کا مقبرہ یا مزار تھا اور اس کے سامنے کئی بھکاری ہاتھ پھیلائے بیٹھے تھے ......جو عورتیں ونہ ون گا رہی ہیں اُن کا مفہوم تھا :

منے میاں کی شادی ہوئی ہے بہار میں
جاؤ کوئی پھول چڑھا دو مزار میں
منے میاں کو سسر بھی بڑے خوش نُما ملے
لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے

ایک عمر رسیدہ خاتون ساتھ سے گزری تو صرف ایک لفظ میں سب کچھ صاف کر گئی ”پاگل“۔

اسی راہ پر گامزن ہم ایک ایسے چوراہے پر پہنچے جو بظاہر ایک چوک تھا لیکن وہاں کیا دیکھا کہ ”لڑکے“ سڑک کے بیچ میں کرکٹ کھیل رہے ہیں۔ جب کسی سے اس کا سبب جانا تو معلوم ہوا کہ آج کسی جماعت نے ہڑتال کی کال دے ڈالی ہے اسی لئے سڑکیں سنسان ہیں اور اکثر بڑے بڑے بازار بند ہیں۔ میں اور وہ صحافی ایک دکان کے برآمدے میں نصب ایک بنچ پر جا بیٹھے۔ ہمارے سامنے پالی تھین کا ایک پہاڑ تھا۔ دوسری طرف دو کتوں، دو بلیوں اور چھ چوہوں کی لاشوں کے علاوہ ایک سندھی گائے بیٹھی جگالی کر رہی تھی۔ اس کے سر کے عین اوپر میونسپلٹی والوں نے ایک چھوٹا سا بورڈ ٹانگ دیا تھا جس پر لکھا تھا ”یہ شہر آپ کا ہے براہ کرم اپنے شہر کو صاف رکھئے...... شکریہ...... بحکم......“ ہم دونوں تھک چکے تھے۔ سوچا کہ غلاظت کے باوجود یہ مناسب جگہ ہے جہاں تھوڑی دیر ستایا جا سکتا ہے۔ چند منٹ کے بعد ہسپتال کی نرسوں کا ایک جلوس وہاں سے گزرا...... ”ہمیں اس پاگل خانے سے ٹرانسفر کرو“ ”رضیہ کو بحال کرو...... اُن کے پیچھے پولیس کی جمعیت چل رہی تھی۔ پتہ

نہیں کہاں سے ایک گرنیڈ آیا اور سندھی گائے کے نزدیک گرا۔ نرسوں کے جلوس میں کھلبلی مچ گئی ......فرسٹریشن کے فوٹوگرافر نے اپنا کیمرہ نکال کر جونہی گرنیڈ پر فوکس کیا ایک زوردار دھماکہ ہوا اور...... ''دھڑا'' کی آواز سے اچانک ''میری آنکھ کھل گئی''...... میرے سینے پر رکھی ہوئی ''جارج ہارڈسٹون'' کی کتاب ''پاگل خانے میں ایک دن'' پلنگ سے نیچے گر پڑی تھی میں نے اُٹھ کر پانی پیا۔ ماتھے کا پسینہ صاف کیا اور کلمہ پڑھ کر دائیں کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

پورا چاند اور آدھی رات

"پہلے دِن وہ مجھے اُس نکڑ پر ملی تھی جہاں روشنی رہتی ہے۔

اُس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور اُس کے خشک اور پژمُردہ لبوں پر پھیکی لیکن بے جان سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی"۔

سلطان نے گلاس میں شراب اُنڈیلتے ہوئے مجھے اطلاع دی۔

"وہ اکیلی تھی!" اُس نے گلاس لبوں تک لے جانے سے پہلے کہا:

"چاند بھی تو اکیلا ہے۔

سورج بھی......!!

اور خدا بھی...... کیوں؟"

وہ مجھے گھورنے لگا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور کھڑکی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

"میرا خیال ہے کہ برف گر رہی ہے......!" پھر اُس نے پردہ سرکا کر کھڑکی کھولی اور باہر جھانکنے لگا۔

یہ جنوری کی ایک سرد ترین رات تھی......سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور کمرے میں چلہ کلان کی کیفیت کا احساس دلانے لگا۔

"کھڑکی بند کر دو یار......!" میں نے اپنے آپ کو کمبل میں سکیڑتے ہوئے سلطان

کو ناراضگی اور تحکم کے لہجے میں کہا:

"تمہیں ٹھنڈ لگتی ہے؟ کہا تو تھا کہ چھوٹی سی پی لو......لیکن میں تمہیں پینے کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔ تم صوفی ہو۔ کمینے......"

اُس نے کھڑکی بند کر دی......

"میں سمجھا تھا شاید باہر برف گر رہی ہے۔ لیکن باہر چاروں طرف اُجلی اُجلی دودھیا چاندنی سڑکوں، چھتوں اور پیڑوں پر پھیلی ہوئی ہے"۔

صاحب وہ مجھے روشنی والے نکڑ پر ملی تھی، اُن دنوں میں نکڑ کی ٹیوب لائٹ کسی شریر لڑکے نے کنکر مار کر توڑ ڈالی تھی اور اُس کے لئے اُس نکڑ کے بغیر کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔" جب وہ مجھے ملی وہ برہنہ تھی۔ چاند نے اُس کے سیاہ فام شریر کو ننگا کر دیا تھا اور وہ سمٹی سمٹائی مارے لجا کے اپنے لمبے لمبے سیاہ گیسوؤں سے اپنے جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کرتے کرتے اس تاریک اور سنسان گلی میں آ چھپی تھی جہاں میں رہتا ہوں......!"

سلطان نے گلاس خالی کیا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

"......رُکو......میں تمہارے لئے کافی بنا کر لاتا ہوں......تم بور ہونے کے علاوہ سردی سے کانپ رہے ہو......"

اس سے پہلے کہ میں "نہیں......" یا اسی قسم کا کوئی اور تکلفاتی کلمہ ادا کر سکتا، وہ چلا گیا تھا۔ پاس صرف ایک کمرہ ہے جس میں مٹی کا ایک پرانا اور میلا کچیلا سا دیا جلتا رہتا ہے۔ اگر تم میرے کمرے میں آؤ گی تو دیئے کی روشنی میں اپنا جسم......

میں ذرا سا ٹھٹکا......ادھر اُدھر دیکھا کہ کہیں میری باتیں کوئی سنتا تو نہیں......ان دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں......

میرے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے اُبھر آئے تھے۔ معلوم نہیں اُس کے

چہرے پر بھی......تمہارے لئے بہتر ہے کہ تم ان ہی اندھیرے گلی کوچوں میں کہیں چپ کر بیٹھے رہو......اور جب صبح ہو جائے تو......تو......اس کے آگے میں نہیں جانتا تھا کہ اُسے کیا مشورہ دوں......اچانک جھنڈا سنگھ ڈرائیور نے کھڑکی کھولی...... کمرے کے اندر کی روشنی گلی میں پڑی اور اتنے میں وہ غائب ہو چکی تھی۔ جھنڈا سنگھ نے دائیں ہاتھ سے ناک صاف کیا اور آسمان کی طرف دیکھا جس پر کالے کالے بادل منڈلا رہے تھے۔ اُس نے بادلوں کو ماں بہن کی گالی دیتے ہوئے کھڑکی بند کر دی۔ میں اس درمیان اپنے مکان نما کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔

میں نے سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ پہلے اپنی سانسوں کو قابو میں کرے اور پھر آگے جو کہنا چاہتا ہو' سُنا ڈالے......

''اب سونا چاہیے......میرے دیئے میں نہ کل تیل تھا نہ آج ہے۔ کل جاب دیا گل ہو گیا تو میں نے سونے کی کوشش کی لیکن بے کار......تم پوچھو گے کیوں؟ دراصل بات ہی کچھ ایسی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے گلی کے سب لڑکے سخت صدمے میں مبتلا ہیں۔'' اُس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کی مشترکہ محبوبہ کوزی کو کوئی اور پہلوان لے اُڑا ہے......خیر پولیس نے کیس رجسٹر کر لیا ہے......دیکھا جائے گا......ایک یہ ہنگامہ......اور اُدھر جہاں ڈرائیوروں کی کالونی ہے۔ آئے دن ہنگامہ ہوتا رہتا ہے۔ کم بخت دارو پی کر خوب دھنگا کرتے ہیں...... مگر تمہیں کیا......ان سب باتوں سے۔

تم نے سنا ہے تین چیزیں بہت مشہور ہیں......صبح بنارس' شام اُودھ یعنی کہ

''شہر کی رات ہے' میں ناشاد اور ناکارہ پھر دل!

جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں۔ اے غمِ دل کیا کروں' اے وحشتِ دل کیا کروں؟ گانا ختم ہوا۔ سلطان نے ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر کو بند کر دیا......اور میری طرف

دیکھنے لگا......کیا ہو گیا......؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ابھی سُنتا......" اُس نے اُٹھ کر کھڑکی کھول دی......اور واپس آ کر ٹیپ ریکارڈر کو پھر آن کر دیا۔

پھر یہی گانا......اُس نے اپنے لبوں پر اس طرح سے اُنگلی رکھی جیسے وہ مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کر رہا ہو۔

چند لمحوں کے بعد گلی سے کسی کے رونے اور سسکنے کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ میں حیران و پریشان سا کبھی سلطان کی طرف دیکھتا، کبھی کھڑکی سے باہر تاریک غلائیں۔ "اے وحشتِ دِل کیا کروں......" گانا ختم ہوا......سسکیاں بھی تاریکی اور سکوت میں ڈوب گئیں......

یہ شمس ہے......بے چارے کو سب پاگل کہتے ہیں......"

"تو کیا......وہ ہے......؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں......وہ شبانہ سے بے حد محبت کرتا ہے جیسے چاند سے چکور......اُس کی کالی کلوٹی محبوبہ اُسے کبھی نہیں مل سکتی۔ وہ ندی کے دو کنارے ہیں......خیر چھوڑو

ہاں تو میں نے بات کہاں چھوڑی تھی۔

ٹھیک یاد آیا۔

"......جب وہ مجھے ملی تو میں اُسے فاحشہ سمجھ بیٹھا۔ جو کسی نئے چکلے یا نئے گاہک کی تلاش میں اندھیری تنگ اور تاریک گلیوں میں آوارہ گھوم رہی ہے۔ بعد میں میں نے اپنے اس نیچ خیال کو بدلا اور اُسے قمر کی رکھیل سمجھ کر اُس کی طرف سے اپنا منہ موڑ لیا۔ اس نے اپنا منہ چھپا کر مجھے پناہ دینے کی درخواست کی اور میں نہ یہ کہہ کر ٹال دیا......میرے لکھنو......اور شبِ مالوہ......

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میرے شہر کا کون سا وقت خوب صورت ہوتا ہے۔ اگر تم بتا سکو......تو انعام کے طور پر میں تمہیں ابھی چلے جانے اور جا کر آرام سے سونے کی اجازت دے سکتا ہوں۔"

میں تمہارے شہر میں ایک اجنبی ہوں ......میں اُسی کالی کلوٹی محبوبہ کی تلاش میں اس شہر میں آیا تھا لیکن جگمگاتے قمقموں اور روشنی کے سمندر میں نہائے ہوئے اس شہر میں وہ مجھے کہیں نہ ملی۔ پھر کسی نے میرے کان میں کہہ دیا کہ وہ تمہارے گھر میں مل سکتی ہے کیونکہ تم ایک کلاکار ہو۔ میں اُس کی تلاش میں یہاں تک آیا اور اُس حقیقت کو یہاں بھی پا نہ سکا...... یہاں بھی مٹی کا ایک دیا روشن ہے۔ تم نے اچھا کیا کہ اُسے اپنے گھر میں پناہ نہ دی۔ ورنہ وہ ننگی ہو جاتی اور اس کا بھید ایک آرٹسٹ کے سامنے کھل جاتا......اب تم ہی بتاؤ میں اُسے کہاں تلاش کروں؟

تم ضرور بتا سکتے ہو......!"

اُس نے ہونٹ سکوڑ کر کہا......میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ میرا شہر اُس کی گود میں سویا ہوا ہے......

اور ہم سب تم اور وہ اُس کے پالے ہوئے بچے ہیں......وہ ہر روز ایک سُورج جنم دیتی ہے۔ اس لئے ہم سب سورج ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی کوڑے کے ڈھیر پر چمک رہا ہے اور کوئی آسمان پر......اور میں اپنے سوال کا جواب بھی پا گیا......میرے شہر کا وہ وقت نہایت خوب صورت ہوتا ہے جب ہم سب کی یہ ماں سورج کو اپنی کوکھ سے نکال باہر رکھتی ہے......"

میں نے کہا......"مجھے نیند آ رہی ہے......اگر میں سورج ہوں تو مجھے اب رات بھر آرام کرنے کے لئے کنہیا کماری میں ڈوب جانا چاہیے۔ شب بخیر......!

☆☆☆

لمحوں نے خطا کی تھی......

ڈرلنگ کی یہ بالکل نئی مشین ہے جو زیر زمین ڈھائی کلومیٹر تک کا حال جان سکتی ہے۔ امریکہ کے مشہور "Geo Physicist" ڈان کو یکسووٹ ڈوم اُس رگ "Rig" کے انچارج ڈرلر تھے جنھوں نے ایک بے آب و گیاہ صحرا اعظم کاشی مرگ مین انوسٹیگیشن "Investigation" کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ اس سے پہلے ایک ماہر طبقات الارض نے امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں ایک تحقیقی مقالہ پیش کیا تھا جس میں ہندوستان کے شمالی مغربی علاقے (صحرا) میں دو سو سال پہلے کے جغرافیائی مطالعے کی Findings اور دریافتیں درج تھیں۔ اسی ارضی سائنس کے ماہر نے امریکی سائنسدانوں کو سروے کی ترغیب دی جسے جیوفزیالوجی کے ماہرین نے 21 مارچ 2205ء کو شروع کیا۔ دنیا بھر کے کمپیوٹروں میں جنوبی ایشیاء خصوصاً شمالی مغربی ہندوستان کے اس علاقے کے بارے میں ہر قسم کی انفارمیشن موجود تھی۔ تاریخ میں دو ڈھائی سو سال کا عرصہ کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن ارضی ماہرین نے اسے بڑی اہمیت دی اور کام شروع کر دیا۔ ایک بیس پچیس کلومیٹر کے ٹکڑے میں تحقیق کا کام شروع کیا گیا۔ رگ "Rig" جس جگہ نصب کی گئی۔ جیولوجسٹ نے تحقیقی مواد اور تصویروں کی مدد سے موقع پر موجود سائنسدانوں کو بریف کرتے ہوئے کہا۔ دو ڈھائی سو سال پہلے اس جگہ کا نام "چار چناری" تھا اور اس کے آس پاس دور دور تک

نیلے پانی کی ایک جھیل ہوا کرتی تھی جسے مقامی لوگ ڈل کہتے تھے۔ اس جھیل کے آس پاس کی پہاڑیوں جنہیں آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں گھنے جنگلوں میں مستور تھیں اور آج یہ ایسی دوشیزاؤں کی طرح عریاں اور بے لباس اس صحرا کے آس پاس اپنا چہرہ اپنی بانہوں میں چھپائے اپنی لٹی لٹائی عصمت اور عزت پر ماتم کناں ہیں اور اب ان کی آنکھوں سے ایک بھی قطرہ آنسوؤں کا نہیں بہتا۔ ان کی آنکھیں بھی ایک ایسے سوکھے تالاب کی طرح ہیں جس میں پتہ نہیں کب کا پانی خشک ہو چکا ہو۔ ان پہاڑیوں کے نام کرالہ سنگری، ہارون، داچھی گام، دارا اور شنکر اچاریہ تھے اور دوسری جانب جو قلعہ نما ٹیلہ نظر آرہا ہے اسے ہاری پربت کہتے تھے۔ وہ جو مسجد کے مینار نظر آرہے ہیں، صرف وہی ایک مقدس مقام بچتا ہے جسے درگاہ حضرتبل کہا کرتے تھے۔ لیکن آج یہاں اذان دینے والا بھی کوئی نہیں رہا۔ کہتے ہیں کہ اس چھوٹے سے صحرا کے تین اطراف ایک خوبصورت شہر ہوا کرتا تھا جس کا نام سوریہ نگر تھا اور جو سرخ پہاڑ آپ دور دور دیکھ رہے ہیں یہ ایک خوبصورت وادی کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔ ان پہاڑوں میں کئی چھوٹی چھوٹی وادیاں ہوتی تھیں جہاں گورے گورے لیکن لاغر اور ذہین لوگ رہتے تھے لیکن اُن میں ایک بہت بڑی خامی تھی کہ وہ کبھی اپنے دماغ سے نہیں سوچتے تھے اور ہر فرد صرف اپنے فائدے کی بات سوچتا تھا۔ اُنہوں نے قدرت کی عطا کی گئی عنایات کو کبھی مناسب ڈھنگ سے استعمال نہیں کیا۔ **Resources** کو ہمیشہ خود غرضی کی بھینٹ چڑھایا۔ نیلے بلوریں اور شفاف پانی میں دنیا بھر کی گندگی اور فضلہ ڈالا، اس کا رنگ بدلا، ذائقہ بدلا، اس میں جو زندگی تھی اُسے پامال کیا، پانی میں گھر بنائے، جھیل کے کناروں کو زرعی اراضی میں تبدیل کیا اور جھیل کو سکڑنے پر مجبور کر دیا اور سکڑتے سکڑتے یہ جھیل ایک دن ختم ہو گئی۔ جھیل کا وجود کیا ختم ہوا کہ اُن لوگوں کے وجود کو بھی زوال آنا شروع ہوا اور پھر آسمانی اور زمینی آفات وقہر نازل ہونے لگے، آدھے سے زیادہ لوگ

موذی امراض میں مبتلا ہو کر چل بسے' آدھے خانہ جنگی میں مارے گئے اور کچھ لوگ ہجرت کر کے ملک کے دوسرے حصوں میں جا بسے۔ نہ یہاں پانی رہا نہ نخلستان' نہ زمین میں نمی باقی رہی۔ جنت چاند میں بدل گئی اور اب یہ قطعہ ارضی جنت کا نشان نہیں بلکہ چاند کی طرح بے جان' سوکھا' جلا ہوا' و بے آب گیاہ ایک ٹکڑا ہے' جس پر زندگی کے آثار کہیں نظر آتے۔

''سر یہاں اس ہول'' Hole ''میں سے پسی ہوئی ہڈیاں نکل رہی ہیں' ایک رگ میں نے ڈان کی ہتھیلی پر بٹ'' Bit '' کے ساتھ نکلا ہوا سفوف رکھتے ہوئے کہا۔

ڈان نے سفوف کو ایک خاص تھیلے میں بند کر کے ایک ملازم کو کہا' اسے لیبارٹری میں بھیجدو'' وہاں کل جو سفوف ہم نے لیپ میں بھیجا تھا اُس کی رپورٹ آ گئی ہے۔ وہ ''پانلی تھین'' تھا' جسے دو سو سال پہلے یہاں کے لوگ ٹنوں کے حساب سے اس جھیل میں پھینکتے تھے۔ ماہرین کہتے ہیں کہ اس صحرا میں پولی تھین کے علاوہ انسانوں' مرغیوں اور مچھلیوں کی ہڈیوں کی کئی پرتیں موجود ہیں لیکن سب سے اوپر ''پولی تین'' کی ایک دبیز تہہ ہے جس نے اس خوب صورت وادی کے خوب صورت لوگوں کو اپنے نیچے دبا کر رکھ دیا اور آخر ان کو تاریخ کے ایک سیاہ باب کا حصہ بنا دیا۔ ''جیالوجسٹ'' کا کہنا تھا کہ اس صحرا میں اب اگلے دس ہزار سال تک زندگی کے آثار پیدا نہیں ہو سکتے کیونکہ پولی تھین نے زیر زمین پچاس کلو میٹر تک کے علاقے کو خشک اور زہریلا بنا دیا ہے۔ ایک معاون ماہر طبقات الارض مسٹر ہیون ڈانگ جو چین کا ہے' نے اس تحقیق میں کئی انکشافات کئے ہیں۔ اتفاق سے وہ بھی اُس جگہ موجود ہے۔ ڈرین مشینوں کے کور "Cover" کا تجزیہ کیا جا رہا ہے اور اس کور میں کئی ایسی چیزیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پانی کے نام پر جو Element رہا ہے اس میں صرف پانچ فیصد پانی اور 95 فیصد پیشاب قارورہ اور پانچ فیصد خون رہا ہے' جس میں دنیا بھر کی تمام قوموں اور نسلوں کے کروسو اور جینز موجود ہیں اور

لیبارٹری ٹیسٹ کے مطابق خون میں H.B. Value بہت کم رہا ہے جبکہ Urine کے Element میں کئی موزی بیماریاں بھی Detect کی گئی ہیں' جن میں AIDS بھی شامل ہے۔

آثار قدیمہ کے سروے کرنے والے آرکیولوجسٹ کی رپورٹ کے مطابق جنگلات کی بے دریغ کٹائی' آفات سماوی' سوکھے وغیرہ سے اس صحرا کے سارے دریا سوکھ گئے ہیں۔ نہ کوئی چشمہ پھوٹ رہا ہے نہ جھرنا بہہ رہا ہے' نہ آبشار گر رہا ہے نہ کوئی پہاڑی نالہ شور مچاتا گیت گاتا بہہ رہا ہے' نہ اس دریا کے کنارے کوئی کوئل کوکتی ہے نہ کوئی مرغابی' راج ہنس یا رام چڑیا ہی دکھائی دے رہی ہے۔ اس وادی پر جو قدرت مہربان رہی ہے اب نالاں ہے۔ تحقیق جاری ہے۔
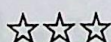
مُلاّ انیک مُرغی ایک

بھلا ہو اردو والوں کا جنہوں نے کئی ایسے محاورے ایجاد کر ڈالے جو ہر دور میں بنا کسی لفظی ہیر پھیر کے استعمال ہوتے ہیں اور کبھی آوٹ ڈیٹ ہوئے نہ ہونگے بلکہ آج کے بعد بھی تا ابد ان کی افادیت میں کمی نہیں آئے گی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے ان گنت چیزوں کو آوٹ آف ڈیٹ بنا کر اُن کی جوازیت Relevance کو چیلنج کر ڈالا لیکن بعض تصورات اور عناصر عدم تا این دم اپنی ابتدائی صورت میں آج تک موجود ہیں۔

بہر کیف ہم اس بحث سے باہر آ کر اردو کے چند ایسے محاوروں کی بات کریں گے جو گزشتہ چار سو سال سے اپنی اصلی صورت اور روح کے ساتھ برتے جا رہے ہیں۔ ان محاوروں میں جو گنے چنے الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ اتنے روز مرہ اور عام بول چال کے الفاظ ہیں کہ وہ کسی بھی زمانے میں مسترد نہیں ہو سکتے۔ پطرس نے کہا تھا کہ گائے اور آلو دنیا کے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں اور ہر معاشرے میں ان کی شناخت بنی رہی ہے۔ دنیا کتنی ہی ترقی بھی کرے گی لیکن گائے اور آلو سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ ہم جن محاوروں کا یہاں ذکر کر رہے ہیں اُن میں ایک لفظ مرکزی کردار (کارول) ادا کر رہا ہے اور وہ لفظ ہے "مرغی"! ......"سونے کے انڈے دینے والی مرغی" ......"گھر کی مرغی دال برابر" ......اگر اپنی مرغی حرامزادی نہ ہوتی تو دوسرے کے گھر میں انڈا کیوں دیتی ......(یہ محاورہ ایک کشمیری محاورے کا آزاد ترجمہ ہے) ......"دو ملاؤں میں مرغی حرام" ......ان محاوروں کے

علاوہ ہوسکتا ہے کہ ''مرغی'' والے محاورے اور بھی ہوں ۔ خیر اس کے لئے یا تو ''لغات'' دیکھنا پڑے گی یا پھر کسی اردو کے پروفیسر یا ماہر لسانیات سے پوچھنا پڑے گا۔ فی الوقت ہم اس ''بدنصیب مرغی'' کے بارے میں ہی بات کریں گے جو دو مُلاؤں میں حرام قرار دے دی گئی تھی ۔ ایک تو بے چاری کی جان گئی اوپر سے حرام قرار دے دی گئی ۔ ہم شب و روز کی تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مرغی ہرگز حرام نہ ہو جاتی اگر یہ مُلاؤں کے بیچ نہ ہوتی ۔ مُلاؤں نے محض ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اور اکیلے ہی ساری مرغی کو ہڑپ کرنے میں ناکامی کے بعد حلال مرغی کو حرام قرار دے دیا۔ ہائے بے چاری مرغی' یہ مرغیاں (اصناف نازک) لوگوں کی حریص نظروں کا مرکز بنی رہتی ہیں' نہ جان نہ پہچان ۔ پڑوسیوں کے مرغے اکر تعلقات بڑھانا شروع کر دیتے ہیں ۔ دوسری طرف ایک پڑوسی کا کتا' دوسے پڑوسی کی بلی' امیدواروں میں شامل ہوتی ہے ۔ بے چاری ایک جان پر اتنے ستم' کچھ بھی ہو تو صرف مرغی خسارے میں رہتی ہے ۔ اردو والوں نے تو مرغی کو صرف دو مُلاؤں میں حرام قرار دے دیا لیکن جہاں مرغی صرف ایک ہو اور مُلا درجن بھر ہوں وہاں کیا صورتحال ہوگی؟

قارئین جانتے ہیں کہ مصطفےٰ کمال اتاترک نے ترکی کے سینکڑوں مُلاؤں کو حج بیت اللہ کرانے کی لالچ دے کر ایک جہاز میں سوار کروایا اور پھر مذکورہ جہاز پراسرار حالات میں بحر اسود میں غرق ہو گیا (یا کروا دیا گیا) ایک تذکرے میں درج ہے کہ خلافت تحریک کو ناکام بنانے میں ان ہی مہلوکین کا ہاتھ تھا۔ قارئین نے الف لیلیٰ ہزار داستان پڑھی ہوگی۔ آپ نے سندھ باد جہازی کی کہانی پڑھی ہوگی ۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ سندھ باد جہازی کو تیسرے سفر کے دوران ایک جزیرے پر ایک ضعیف اور معذور و ناتوان بوڑھا درخواست کرتا ہے کہ مجھے اپنے کندھے پر اُٹھا کر لے چلو۔ سندھ باد کو اس بوڑھے کی حالت پر رحم آتا

ہے۔ جوں ہی وہ اسے کندھے پر اُٹھالیتا ہے تو وہ سندھ باد کو اپنے تسموں سے اس طرح جکڑ لیتا ہے کہ اس کی سانسیں بند ہو جاتی ہیں۔ سندھ باد نے اس مکار بوڑھے (عفریت) کو ''پیر تسمہ پا'' کہا ہے۔ وہ اس ''پیر تسمہ پا'' کے سحرے سے کیسے نمٹتا ہے اور کیسے اپنے آپ کو آزاد کرواتا ہے...... یہ آپ آج ہی ''الف لیلیٰ ہزار داستان'' میں پڑھ لیجئے۔ میں پھر واپس اپنے اصلی موضوع پر آتا ہوں یعنی ''مرغی اور مُلا (یعنی کہ ''دو مُلا'' ......!) میں نے یہی سوال ایک پٹواری سے پوچھا تو اس نے لٹھے پر کچی پنسل سے کچھ نشانات اور لکیریں کھینچتے ہوئے کہا چونکہ مرغی کے ہر عضو کو دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے لیکن سر کو نہیں کیونکہ سر صرف ایک ہوتا ہے اور اگر سر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے تو پھر سر سر نہیں رہتا......'' ایک ناقد ادب ولسانیات نے کہا دراصل یہ مرغی دو مُلاؤں میں نہیں بلکہ نو مُلاؤں میں حرام قرار دے دی گئی ہے۔ مولوی عبدالحق نے کاتب سے کہا لکھو ایک مرغی نو مُلاؤں میں حرام' تو کاتب نے نو کو دو سمجھ لیا۔ مجھے اس نظریئے میں تھوڑا سا دم نظر آتا ہے کیونکہ میرے سامنے جو مرغی مذبوح حالت میں پڑی ہے' اس کے چاروں طرف نو مُلا کھڑے ہیں۔ سبھوں کے ہاتھوں میں آب وتاب والے چاقو چمک رہے ہیں' اُن کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں' اُن کے ادہان مبارک سے شعلے لپک رہے ہیں اور باچھوں سے خون ٹپک رہا ہے...... وہ ایک دوسرے کو خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں...... وہ ایک حلقے میں کھڑے ہیں اور اُن کے بیچ مزبوح مرغی جسے وہ حرام قرار دے چکے ہیں' بے گور وکفن پڑی ہے' قریب کے ایک درخت پر بیٹھے ایک کوا اور ایک چیل درخت کی شاخوں سے اپنی چونچیں صاف کر رہے ہیں اور ساتھ کی دیوار کے سائے میں لیٹا ہوا ایک کتا اپنی نیم وا آنکھوں سے مرغی کی طرف دیکھ لیتا ہے اور پھر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ دراصل ''اسے مُلاؤں'' کے سین سے ہٹنے کا انتظار ہے۔

☆☆☆

نیا ہزارا

کسی شاعر نے سبحان اللہ کیا خوب عرض کیا ہے۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے   زندگی یونہی تمام ہوتی ہے

صبح ہو یا شام' دن ہو یا رات' سیکنڈ ہو یا منٹ یا گھنٹہ' یا ہفتہ یا ماہ و سال' یہ سب اکائیاں ہیں۔ اس وقت کہ جب وہ اتنا بوڑھا ہو چکا ہے کہ اسے خود بھی معلوم نہیں کہ اس کی ابتدا کب کیوں اور کیسے ہوتی؟ یہ بوڑھا سورج کو جس کے اندر آج بھی زندگی کی اتنی تمازت ہے کہ جب شام کو غروب ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ صدیوں کا سفر طے کر کے دادا جان بہت تھک چکے ہیں اور اب شاید کئی دن ستا کر لوٹیں گے لیکن اگلی صبح یہ حضرت پہلے سے تر و تازہ اور تابناک اور درخشندہ اور پر جلال طلوع ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ نہ جانے کب سے شروع ہوا ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ واللہ اعلم!

معلوم دور کے انسانوں نے وقت کا حساب کتاب اس زمانے سے رکھ چھوڑا ہے جب عقلیت کا دور شروع ہوا۔ یعنی ڈھائی تین ہزار سال پہلے سے۔ ''اسی لیکھے'' ہم آج تیسرے ہزارے یا ملینیم ''Millanium'' میں قدم رکھ چکے ہیں۔ یہ ہزارہ عیسویں سن کے حساب سے شروع ہوا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے نہ جانے کتنے ہزارے اس راہ سے گزرے ہوں گے۔

یوں بھی ہر جاندار شئے کا ہر دن اس کی زندگی کا پہلا اور آخری دن ہوتا ہے۔ پھر بھی

نہ جانے کیوں مہذب سماج ایک مخصوص دن کو سال یا صدی یا ہزارے کا پہلا دن مان کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔

گزشتہ برس ہم نے ایک نیا تماشہ دیکھا۔ ہمیں یاروں دوستوں اور عزیزوں نے کہا کہ یہ سال رواں صدی (جواب بیت چکی ہے) کا آخری سال ہوگا۔ اس کے بعد نہ صرف نیا سال آئے گا بلکہ نئی صدی کا آغاز ہوگا اور نئی صدی نئے دلہن بن کر آئیگی۔ اس لئے بقول ان کے انکا استقبال کرنا لازمی ہے۔ بات آئی گئی ہوتی لیکن جوں جوں پرانے سال کی رخصتی کا وقت قریب آگیا بازاروں میں ایک عجیب وغریب رونق آئے۔ ہر طرف بینر لگ گئے۔ جن پر اردو اور انگریزی میں نئے سال نئی صدی اور نئے ہزارے کی سواگت کے لئے منتخب جملے لکھے ہوئے تھے۔ کُتب فروشوں، نیوز ایجنسیوں، منیاری فروشوں اور فٹ پاتھوں پر نئے سال، صدی، ہزارے کے مبارکبادی کے کارڈ بکنے لگے۔ ان کی دیکھا دیکھی پرچون یا تھوک یا کریانہ بیچنے والوں، قصائیوں، نانبائیوں، حلوائیوں کی دکانوں پر بھی رنگ برنگے خوبصورت کارڈ آویزاں نظر آنے لگے۔ ان دوکانوں پر بھیڑ قابل دید تھی۔ بچے بچیاں، لڑکے لڑکیاں، جوان مرد، عورتیں بوڑھے اور بوڑھیاں سپاہی، حکیم، چور، رشوت خور آفیسر، فوجی جوان، ٹانگے بان، امیر غریب، کالے گورے، بلالحاظ مذہب ملت، رنگ ونسل، ذات پات، عمر جنس، ان کارڈوں کی خرید وفروخت کررہے تھے اور پھر وہ دن بھی آپہنچا جب یہ کارڈ ایک دوسرے کو بھیجے جانے لگے۔ بذریعہ ڈاک، بذریعہ چپراسی، بذریعہ ہاکر، بذریعہ ٹیلی فون، بذریعہ ٹیلی ویژن، بذریعہ ریڈیو، بذریعہ ای میل، بذریعہ انٹرنیٹ......

ہماری میز پر بھی کارڈوں کا ایک ڈھیر ہوگیا۔ ان میں لگ بھگ ایک ہی بات تھی۔ کارڈ اُردو میں تھے۔ مفہوم کچھ اس طرح تھا۔ نیا سال مبارک، نئی صدی مبارک، نیا ہزارا مبارک، خدا کرے آنے والا سال آپ کی زندگی میں آپ کی زندگی خوشحالی، امن اور ترقی

کے اجالے پیدا کرے۔ خدا کرے آپ اسی طرح اگلی صدی بھی دیکھ سکیں، آپ سلامت رہیں ۔ ہزار برس، ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار، ہماری تمنا ہے کہ نیا سال آپ کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا نیا سندیشہ لیکر آئے وغیرہ وغیرہ۔ ان میں کچھ دعائیں اچھی تھیں جو ہمیں پسند آئیں۔ لیکن ہزار برس تک جینے کو لیکر جو دعا دی گئی تھی بظاہر ایک رسمی دعا تھی لیکن یہ ہمیں بددعا سے کم نہ لگی۔ چند ایک کارڈ ایسے کرم فرماؤں نے بھجوائے تھے جو بظاہر ہمارے خون کے پیاسے تھے بلکہ ہوسکتا ہے کہ کئی بار ہمارے قتل کا فیصلہ بھی کیا ہوگا۔ مگر رسم دنیا نبھاتے ہوئے ہمارے جنازے میں وہ ضرور شامل ہوتے بلکہ چند آنسو بھی بہاتے

31 دسمبر رات دیر تک ہم ان کارڈوں میں بھرے ہوئے مہر و خلوص، مٹھاس اور لذت سے لذت آشنا ہوتے رہے۔ سونے سے پہلے ہمارے فرزندار جمند نے ہمیں نئے سال کی مبارک باد دی۔ ہمارے رفیقہ حیات نے اتنا بھی کہا کہ خدارا اب سو جاؤ۔ صبح ذرا جلدی جاگنا۔ نیا ہزارا ہوگا۔ صبح کاذب اٹھ کر نماز پڑھنا اور دعا مانگنا کہ نیا ہزارہ ہم سب کے لئے بنی نوع انسان کے لئے خوشی اور خوشحالی اور امن کا نقیب ثابت ہو وغیرہ وغیرہ اور اہم یہی دعا کرتے کرتے......

حسب معمول صبح 8:30 بجے ہم نے آنکھ کھولنے کی کوشش کی۔ حسب معمول اور حسب عادت ہمارا ہاتھ سرہانے لگے ہوئے بجلی کے بٹن کی طرف بڑھا جسے دبانے سے سامنے میز پر رکھا ہوا ٹی وی آن ہو جاتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہوا ہم نے ادھ کھلی آنکھوں سے ٹی وی کی طرف دیکھا۔ اسکرین پر روشنی پھیلتے ہی ایک کالا دہشت ناک ہاتھ جس میں ایک خوفناک پستول تھی۔ ہماری طرف بڑھا۔ پستول کی نال سے گولیاں چلیں اور ہم بستر پر ڈھیر ہوگئے لیکن ہم مرے نہیں ہم گولیاں چلنے کی آوازیں سنتے رہے کیونکہ اب ہماری بند آنکھیں پوری بند ہوگئی تھیں۔ ٹھائیں ٹھائیں ......شیں شیں،...... اتنے میں کہیں سے ہمارا

فرزند کمرے میں آ گیا تھا۔ اس نے چینل گھمایا تو رسولن باتی کی ٹھمری ہیلو سنائی دی جو پستول سے نکلنے والی گولیوں سے اچھی لگی۔ اسی درمیان بجلی کے تار پر کوئی کوا (شاید) آ کر بیٹھا تو بجلی آنے جانے لگی۔ رسولن بائی گولویں کے مقابلے میں میرے لئے قابل قبول تھی لیکن ہمارے فرزند کو کلاسیکی موسیقی سے اتنی چڑ ہے جتنی ہماری بیوی کو کتابوں سے۔ اس نے آتی جاتی بجلی میں چینل گھمانے کا سلسلہ جاری رکھا چنانچہ نئے ہزارے کی صبح جو بولیاں اور باتیں ہم نے سنیں وہ گزشتہ دو ہزاروں کی صبح کو آج تک کسی نے نہیں سنی ہوتیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

''......نئے سال کا نذرانہ''......

''تڑک تڑک......تڑ تڑ تڑ''......دھڑک' ڈرک'' ڈڑ......واواوا......'' (چینل گھمایا جا رہا ہے) راشٹر پتی کلنٹن نے کہا ہے......کمینے میں تیرا خون ہی پی جاؤنگا'' ٹھائیں......ٹھک......ٹھکا......ٹھکا......ٹھک......ٹھائیں۔

''......(بجلی گئی) لالو پرساد یادو نے کہا ہم کاہتے تھے۔ کاہتا ہوں''......اور کاہتا رہوں گا کہ ہم دلت سماج......(بجلی آف) کو زندہ گاڑ دیں گے''......(افوہ میرے خدا یہ کرخت آواز کہاں سے آ گئی۔ اس سے گولیوں کی آوازیں اچھی تھیں) ہم......(بجلی آف) اُلو کے پٹھے۔ (بجلی پھر آ گئی) طیارہ سازش کیس......قندھار ڈرامہ ختم......چلی چلی رے پتنگ میری چلی رے سر سسار''......دس پروگرام......خون کی ہولی......واز براٹ ٹو یعہ......ہو ہو آئی ملن کی بیلا''......ریل گاڑی میں دھماکہ دس ہلاک''......منی پور کشمیر......پیپلز وار......چھیچنیا چلی بادلوں کے پار'......ڈور یہ سوار......منتری رنگے ہاتھوں گرفتار۔ اجتماعی عصمت دری کے الزام میں ایم ایل اے ملوث......آئین میں ترمیم لازمی......آہا۔ آہا۔آہا......ہاہاہا۔ ہی ہی ہی۔ ہو ہو ہو۔ تک دنا دن تک دنا دن۔ ملینئسن مسلقفیئے۔ لاہور میں

مسجد کے اندر فائرنگ 8 شہید...... ہماری سمسیا یہ ہے کہ...... یہاں کوئی نہیں تیرا مسافر ...... یہ پتھر کا دیس بے پگلے، روشن کے سنگیت میں مناڈے اس کے بعد بجلی کئی دنوں کے لئے رخصت ہوگئی۔

ہم نے کروٹ بدلی تو میز پر صبح کا اخبار پڑا تھا...... چلو......اخبار ہی پڑھا جائے۔ فرنٹ پیج یعنی پہلا صفحہ ہمیشہ پہلے ہی پڑھتا لیکن مہذب ممالک میں لوگ صبح اٹھ کر اخبار کا چوتھا صفحہ یا پانچواں صفحہ پڑھنا شروع کرتے ہیں کیوں کہ تازہ ترین خبریں آخر میں ہوتی ہیں اور وہ بھی بغیر تصویروں کے۔ صفحہ اول پر حادثوں کی تصویریں لاشوں کے کھلے منی کھلی آنکھیں کٹے اعضا خون ہی خون، مسخ چہرے، وہاں کوئی صبح سویرے یکھنا نہیں چاہتا۔ اسے برا شگون سمجھتے ہیں اور اگر کوئی فرنٹ پیج پڑھ لے تو دن بھر اس کا موڈ خراب رہتا ہیں۔ ہمارے یہاں جان بوجھ کر موڈ بگاڑنے والی خبریں پہلے صفحہ پر چھاپنے کا رواج ہے اور...... جونہی ہم نے پہلے صفحہ کی سرخیوں پر نظر دوڑائی ہر طرف خون خرابہ موت کا ننگا ناچ، سنسنی خیز الفاظ اور رونگٹھے کھڑے کر دینے والی خبریں ہمیں نئے ہزارے میں یہ امید نہیں تھی کہ وہ آتے ہی ہمیں اس قسم کے نذرانے دیگا۔ ہم نے اخبار اور آنکھیں بند کر لیں اور کارڈوں پر لکھی ہوئی تحریروں کو یاد کرنے لگے۔ محض دل بہلانے کے لئے

(پنجابی میں حساب کتاب کے کھاتے یا لیکھا حساب کو کہتے ہیں۔

سفید سویرا

کشتی دھیرے دھیرے لہروں کے اوپر سے پانی کو چیرتے کاٹتے ہچکولے کھاتے ہوئے آگے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس میں سوار ہر عمر جنس رنگ و نسل کے لوگ کچھ بیٹھے، کچھ لیٹے، کچھ کھڑے ہوئے، کچھ خاموش تھے، کچھ باتیں کر رہیں تھے، کچھ سن رہے تھے۔ ایک بزرگ کو دیکھ کر ایسا لگا کہ کشتی کے سفر کرنے سے پہلے ہی وہ اپنی زندگی کا سفر پورا کر لے گا۔ ایک شیر خوار کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کہ اس کی زندگی کا سفر کشتی سے شروع ہوا ہے۔ ایک خاتون کے کندھے پر بیٹھی ہوئی بلی کشتی کے فرش پر رکھے ہوئے پنجرے میں اونگھتے ہوئے طوطے کی طرف ٹکٹکی باندھ دیکھ رہی تھی جس کا مالک اُس کی قسمت اور طوطے کی طرح سویا ہوا تھا۔ اُن کے سامنے کھڑے ایک فوجی کا السیشن کتا کبھی بلی کو دیکھتا اور کبھی طوطے کو اور پھر آنکھیں بند کر لیتا اور پھر منہ بند کر آنکھیں کھول لیتا۔ اُس کی زبان اُسکے منہ سے باہر لٹکنے لگتی اور زبان کی نوک سے رال بہنے لگتی۔

بزرگ نے دوسرے شخص سے مخاطب ہو کر کہا...... "لگتا ہے طوفان آنے والا ہے"۔

دوسرے شخص نے اثبات سے سر ہلا کر کہا۔ محکمہ موسمیات کی پیشن گوئی ہے کہ تیز آندھیاں بھی چلیں گی اور...... "وہ ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ بادل گرجے، بجلی چمکی اور پانی برسنے لگا۔ لہریں اونچی ہونے لگیں۔ کُتے کے کان آگے کی طرف جھک

گئے اور اُس نے اپنی دم پچھلی ٹانگوں میں سمیٹ لی۔ بلی نے ایک انگڑائی لینے کے بعد آنکھیں موندلیں۔ طوطے نے پر پھڑ پھڑائے اور آنکھیں کھول لیں۔ بزرگ نے مسکرا کر کہا......''لوگو! اپنے اپنے خدا کو یاد کرلو۔'' ایک شخص نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے اپنی جیب سے ایک سکہ نکال کر اُسے پانی میں پھینک دیا۔ اُسکے پیچھے کھڑے ایک میاں جی نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔''اے مالک ہم سب کا بیڑہ پار لگا۔'' میرے دائیں طرف دُبکے ہوئے ایک بھائی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔''پربھو ہمیں سلامت رکھے'' اور پھر چاروں طرف سے دھند نے ناؤ کو گھیر لیا۔ اب کوئی کسی کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہم کہاں جارہے تھے کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ کسی نے کہا رات ہوگئی اور ہم راستہ کھو چکے ہیں اور آواز آئی وہ دیکھو قوسِ قزح کے سارے رنگ سمٹ گئے ہیں۔ ہر طرف سُرخ رنگ چھایا ہوا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے بارش کا رنگ بھی لال ہونے لگا۔ پھر آواز آئی ......دیکھو آسمان سے لہو برسنے لگا ہے۔ ناؤ خون سے بھرنے لگی۔ آواز آئی ...... کچھ جلاؤ' روشنی کرو' مانجھی کے ہاتھ سے پتوار چھوٹ گیا ہے۔ دور سے آواز آئی۔ اچانک بجلی چمکی اور ہم سب تیز روشنی میں نہا گئے۔ ننھا شیر خوار گود مادر میں دبکا دائیں ہاتھ کا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ اُس کے دہنِ نازک کے کونے پھیلے ہوئے تھے اور اُس کے لبوں پر خون لگا ہوا تھا۔ میں دہشت کے مارے کانپ گیا۔ پھر بجلی چمکی کتا آسمان کی طرف منہ اُٹھا کر رونے لگا۔ پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا اور اُس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک جزیرے میں ہری ہری دھوب پر لیٹا ہوا تھا۔ طوفان تھم چکا تھا۔ میں نے گردن گھما کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اچانک میری نظر اُس شیر خوار بچے پر پڑی جو صنوبر کے ایک دبیز تختے پر لیٹا ہوا اپنے پاؤں کا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ اُس کے اوپر کوے اور گدھ منڈلا رہے تھے اور ایک طرف سے ایک خونخوار مگرمچھ اور دوسری طرف سے ایک اژدہا منہ کھولے بڑھے چلے آرہے تھے۔

بچہ مسکرارہا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور بے اختیار اُس بچے کی طرف بڑھنے لگا کہ اچانک ایک آواز نے میرے قدم روک دیئے۔ ''نادان آگے مت بڑھو۔ یہ جانور تمہیں پورا نگل لیں گے بچے کو اس کے حال پر چھوڑ دو''۔ میں نے کہا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔ انسانیت کا تقاضہ ہے کہ......'' پھر ایک پراسرار قہقہے کے بعد وہی آواز آئی۔ ''انسانیت......؟ ہاہاہا......! یہ ہتھیار اژدہے اور مگر مچھ کو نہیں روک سکتا......''

تو پھر کیا میں ان بلاؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں تا کہ وہ اس معصوم ننھے بچے کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھائیں اور ہم صرف دیکھتے رہ جائیں۔''

''نادان صرف جذبات ہی سب کچھ نہیں ہوتے۔ ادھر دیکھو آگے کیا ہوتا ہے !''

یہ کون ہے جو مجھے آگے بڑھنے سے روک رہا ہے؟ میں نے پہلی بار اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے ڈھونڈ نکالا۔ وہ ساحل سے دور کھجور کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ مین اُس کے نزدیک گیا۔ اُس کے سامنے ایک سفید کینواس تھا۔ جس کے اوپر انگریزی کے دو حرف (جلی) لکھے ہوئے تھے۔ UN وہ شخص بھی سر سے پیر تک سفید کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اُس کے سر داڑھی اور بھنوؤں کے بال دودھ جیسے سفید تھے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک برش تھا۔ میں نے اس سے پوچھا اے شخص تم کون ہو؟ اُس نے کہا ''میں ایک مصور ہوں......''

میں نے پوچھا کہیں تم سندھ باد جہازی یا پھر پیرِ تسمہ پا تو نہیں ہو۔؟''

اُس نے کہا۔ ''نہیں...... میں صرف ایک مصور ہوں۔ میں اس کینواس پر بنی نوع انسان کے لئے ایک مشترکہ آئین بنانا چاہتا تھا اور اس کے لئے میرے ذہن میں جو خاکہ تھا وہ میں اس کینواس پر بکھیرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں اس کینواس پر صرف دو حروف ہی لکھ پایا ہوں...... یہ دو حرورف سعد کو نحس بنا ڈالتے ہیں۔ کیونکہ یہ خود اپنے اندر منفی معنی کے حامل

ہیں۔ تم جسٹ، لک، لکی، فار چونٹیلی، ٹوورڈ، ڈن، لافل، رلائے ایبل، اتھنٹک، اتھرائیزڈ، جسٹس، وانٹڈ، لائیک، نیچرل۔ ان کے آگے لکھو تو سب کے معنی بدل جاتے ہیں بلکہ یہ دو حروف سعد کو اُس کی ضد بنا دیتے ہیں۔ میں نے تھوڑی دیر تامل کیا۔ بوڑھے کی باتوں پر غور کیا اور پھر میں نے اُس کے ہاتھوں سے برش لے کر اُسے سفید پینٹ میں بگھو کر یوا ین کے اوپر پھیر دیا۔ کینواس صاف ہو گیا۔ بڑھا مسکرایا اور اُس نے کینواس اور برش دونوں اُٹھا کر پانی میں پھینک دیئے۔ یکا یک اس کینواس کے اوپر لہو کا رنگ اُبھر آیا۔ بوڑھے مصور نے کہا اُدھر دیکھو۔ میں نے دیکھا کہ برش بچے کے ہاتھ میں ہے اور وہ ایک بھالے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ بچے کی آنکھوں سے شعلے لپک رہے ہیں اور اُس نے اس بھالے سے دونوں خونخوار جانوروں کو مار ڈالا ہے۔ اُن کا خون سطح آب پر پھیلا ہوا ہے اور کوے اور گدھ گائب ہو چکے ہیں۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں الف، میم اور نون جلی حروف میں لکھے ہوئے تھے۔ اچانک میرا پاؤں پھسلا اور میں دھڑام سے گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنے آپ کو میز پر جھکے ہوئے پایا۔ میری کہنیوں کے نیچے دبے ہوئے اُردو اخبار کی شہ سرخی میرا منہ چڑا رہی تھی......''اقوام متحدہ کو ختم کرنے اور اُس کی جگہ ایک فعال عالمی ادارے کے قیام کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے۔''

روزی

صُبح بنارس، شامِ اَودھ اور شبِ مالوہ تین شہروں کے تین اوقات میں نے پڑھے بھی ہیں سُنے بھی ہیں کہ بہت خوبصورت ہوتے ہیں لیکن دیکھنے کا موقعہ صرف شامِ اودھ کا ملا۔ جب ایک شخص نے حضرت گنج تھانے کے سامنے ایک دوشیزہ کا گلے میں اپنی بانہوں کی مالا پہنا کر اُسے دوست کی ماروتی میں بٹھا کر لے جانے کی جرات کی اور دوشیزہ نے سرِ شام اَودھ ہی اپنی کولھاپوری سے اُس کی آرتی اُتار ڈالی۔

جس کے بعد حوالدار نے اُس مجنون کو سسرال پہنچا دیا۔ اُس وقت میں ذاکر میاں کی جیولری کی دکان میں بیٹھا شام کے اخبار سے آنے والے کل کے بارے میں موسم کی پیشینگوئی پڑھ رہا تھا۔ چھینا جھپٹی میں کسی کے لہو کے چند قطرے ذاکر میاں کے چکن کرے پر بھی آ گرے، جسے وہ پان کی پیک سمجھ کر بات کھا گیا۔ بس میں نے اَودھ کی دہی شام دیکھی تھی اور اگلے دن بنارس کی صبح اور مالوہ کی رات دیکھنے کا پروگرام کینسل کر کے چار باغ کا رخ کیا اور اپنے شہر لوٹ آیا جس کی کوئی اوقات نہیں۔ نہ کوئی وقت خوبصورت ہے۔

یہاں میں جس مکان میں رہتا ہوں وہ میرا نہیں البتہ جس کسی کا بھی ہے اُس نے اُس کے دو کمرے مجھے کنایے پر دے رکھے ہیں۔ میں یہ سطور تحریر کرتے وقت بے روزگار

ہوں۔آپ سوچ رہے ہونگے کہ پھر کرایہ کیلئے رقم کہاں سے لاتا ہوں۔دراصل میرے کمرے کا کرایہ میرے مکان کا مالک خود اپنی جیب سے ادا کرتا ہے میں اس کے بدلے اُس کے دولڑکوں کو دو گھنٹہ پڑھاتا ہوں۔ایک لڑکے کا نما ارشد ہے دوسرے کا نام جمیل۔ارشد مجھ سے دوسال اور جمیل ارشد سے دوسال چھوٹا ہے۔دونوں نویں درجہ کے طالب علم ہیں۔میں نے پچھلے سال اُردوادب مین ایم اے کیا ہےاوراب ایک شفیق استاد پی ایچ ڈی کرانے پر تلے ہوئے ہیں۔موضوع انہوں نے خود اپنی ہمہ جہتی اور ہمہ پہلو شخصیت کومنتخب کیا ہےاُن کی کافی چیر پھاڑ کرنا ہوگی۔

جس کمرے میں، میں رہتا ہوں اسمیں مجھ سے پہلے لاٹری کی ٹکٹیں فروخت کرنیوالے ایک ایجنٹ صاحب رہتے تھے کیونکہ کھڑکیوں میں شیشوں کی جگہ لاٹریوں کے اشتہار مُڑدیئے گئے ہیں۔دیواریں اُن اخباروں سے مزین ہیں جن میں نتائج شائع ہوتے تھے۔یہ الگ بات ہے کہاس ایجنٹ نے انہی کھڑکیوں میں سے کسی ایک کھڑکی سے چھلانگ مارکر خودکشی کرلی تھی۔سونے سے پہلے میری عادت بن گئی ہے کہ سارے کمرے کی دیواروں پر لگے ہوئے اشتہاروں اور اخباروں کا ہلکا سا مطالعہ کرلیتا ہوں۔

کروڑوں، لاکھوں روپے کے کرنسی نوٹ رات بھر خواب میں دیکھتا ہوں۔کئی مرتبہ میرے نام کروڑوں روپے کی لاٹری بھی نکلی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اتنے نوٹوں سے میرے ہاتھ بھی میلےنہیں ہوئے۔صبح بنارس، اور شام اودھ جی ہاں......میرے محلے کی صبح اورشام......میرے کمرے کی صبح اور شام......گزشتہ دوماہ سے یہ دونوں اوقات میرے لئے ......روز صبح میری آنکھ ایک صدا سے کھلتی ہے۔یہ آواز مکان کے دائیں نکڑ سے آتی ہے۔پہلے دھیمی ہوتی ہے پھر دھیرے دھیرے یہ اونچی اور کرخت ہوتی جاتی ہے۔جیسے کوئی بگڑے ہوئے ریڈیو کا والیوم بڑھا رہا ہو۔یہ صدا ایک گداگر کی ہے جو کہتا ہے" سکندر د

اپنے مقدر کا صدقہ دیدو' اللہ کے نام پر غریب کو ناشتہ کراؤ' قسمت والو بدقسمت فقیر کی سنو ......دیدو......دیدو' اور بھی بہت کچھ کہتا ہے اُس کے الفاظ اُسکی آواز کے ساتھ دل میں اُتر جاتے ہیں۔ کافی پڑھا لکھا فقیر لگتا ہے کبھی گرائمر کی ایک غلطی بھی نہیں ہوتی۔ لسانیت پر عبور رکھتا ہے میں نے کبھی اُس کی صورت نہیں دیکھی بس آواز سنی ہے جیسے آل انڈیا کے بوڑھے اردو نیوز ریڈر کی آواز برصغیر کے ہزاروں لوگ گزشتہ پچاس سال سے سنتے آرہے ہیں۔ پتہ نہیں یہ فقیر بوڑھا ہے یا میری طرح جوان یا آل انڈیا ریڈیو کے نیوز ریڈر کا ہم عمر۔

دوسری آواز مکان کے بائیں جانب سے آتی ہے "روزی ......اے روزی...... روزی......روزی" یہ آواز بھی پہلے دور سے آتی ہے پھر قریب ہوتے ہوئے میرے کمرے کے اتنے نزدیک ہوجاتی ہے کہ کھڑکی سے نہ صرف صاف سنائی دیتی ہے بلکہ دکھائی بھی دینے لگتی ہے...... یہ آواز گندمی رنگ کی ادھیڑ عمر' دوہرے بدن کی ایک آنٹی کے منہ سے نکلتے ہوئے میں نے خود اپنے کانوں سے دیکھی ہے اور پھر ویڈیو گیم کی گولی کی طرح یہ آواز ایک پھر میرے نازک سے بدن رکھنے والی ایک سیاسہ نیم سیاہ لڑکی سے جاٹکراتی ہے جو اپنے مکان کی چھت پر دوتین لڑکوں کے ساتھ پتنگ اُڑارہی ہوتی ہے۔ کیا ہے ممی......آئی ممی......ٹھہرو ممی......ایک منٹ ممی...... یہ آواز اس لڑکی کے منہ سے نکلتی ہے جسے اُس کی ماں روزی کہہ کر پکارتی ہے......روزی کی آواز اُس کی صورت کے برعکس ہے۔ جب وہ بات کرتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ فاختہ بول رہی ہو اُس کے گلے میں جیسے ہلکی کلاسیکی موسیقی کے سب اساتذہ بیٹھے اپنے اپنے انسٹرومنٹ بجا رہے ہوں۔ روزی کی عمر 18 اور بیس کے درمیان ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ ہو یا کم بھی اندازہ غلط بھی ہوسکتا ہے صرف روزی کے معاملے میں"۔

مجھے یہ نام پتہ نہیں کیوں کچھ اچھا سا لگتا ہے اور لگے گا۔ شاید اس لئے کہ میں بے

روزگار تھا اور مجھے روزی کی تلاش تھی...... ہر صبح ماہر لسانیات فقیر کی صدا...... ہر شام روزی کو بلاوا...... یہ دو چیزیں اب میرے معمولات میں شامل تھیں۔ میرے خواب بھی حسب حال ہوتے، کبھی کروڑ پتی ہوتا۔ کبھی روزی کے ساتھ پتنگ اُڑاتا، کبھی فقیر بنکر صدائیں دیتا ......ایک دن فقیر کی صدائیں اچانک رک گئیں میں نے کھڑکی پر کھڑے رہ کر دم ساتھ کر سننے کی کوشش کی مگر کہیں میرے کانوں میں کوئی خرابی تو نہیں آ گئی لیکن باقی سب کچھ سنائی دے رہا تھا میں نے پہلی بار ایک خلا سا محسوس کیا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ کہیں خدانخواستہ...... افسوس کہ میں اس عظیم انسان سے ملاقات تک نہ کر سکا۔ وہ میرے لئے ایک اہم چیز بن گیا تھا میں کمرے سے نکل کر سیدھا اُس گلی کی طرف چل پڑا جہاں سے روز وہ شخص وارد ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر گھومنے کے بعد میں نے دودھ والے بھیا سے پوچھا! چاچا وہ فقیر کہاں ہے جو روزانہ...... ارے وہ اگلی نکڑ پر ہے اُس نے اب ٹھیلے میں شربت اور جوس بیچنے کا دھندا شروع کر دیا ہے۔

اس دن میں نے پہلی بار اُس آدمی کو دیکھا جو اپنے آپ کو بدقسمت اور ہمیں قسمت والے کہہ کر اپنی صبح شروع کرتا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا تنومند شخص تھا۔ چہرے پر چمک کے گڑھے پڑ گئے تھے اور ایک ٹانگ بیکار تھی بیساکھی اس نے ٹھیلے کے اوپر رکھ چھوڑی تھی۔ قسمت والو...... آؤ! پیو میٹھے ملیح آبادی آموں کا رس، ناگپوری سنگترے، کشمیری سیب، خدا آپ کو صحت بخشے۔ صحت والو...... آؤ...... آؤ صرف دو روپے میں گلاس......

وہ دن ہی کچھ عجیب تھا شام کو نہ روزی چھت پر آئی نہ وہ آواز آئی نہ آنٹی آئی، البتہ بچے حسب معمول پتنگ اُڑانے آ گئے۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر ایک لڑکے سے پوچھا...... بھئی وہ روزی کہاں ہے آج؟...... معلوم نہیں کہہ کر ڈوری سمیٹنے لگا، دوسرے بچے نے بھی یہی کہا، تیسرے لڑکے نے کہا! "وہ گھر پر نہیں ہے" ایک اور خلا...... یااللہ یہ سب کیا

ہے۔ ایک ہی دن یہ سب کچھ ہونا تھا۔ ہاں ایک اور چیز بھی آج غائب تھی ''روزی کا مرغا اور اس کی مرغی جو دونوں کوٹھے پر چگتے رہتے تھے۔ مرغا عصر کے وقت میری کھڑکی پر چڑھ کر دو چار مرتبہ اذان دیتا اور پھر اپنی رفیقہ حیات کے ساتھ نیچے اتر جاتا...... میں بھاری قدموں سے نیچے اُترا۔ دروازے پر روزی کی ماں مرغے کو دانہ ڈال رہی تھی۔ میں نے سلام کیا...... جیتے رہو۔ کیسے ہو بیٹے؟...... جی اللہ کا شکر ہے آج روزی کو چھت پر نہیں دیکھا۔ خیریت ہی تو ہے؟...... ہاں ...... ہاں بیٹے وہ آج سے سرکاری نوکر ہو گئی ہے۔ ڈیپارٹمنٹل سٹور میں کام کرنے لگی ہے۔ آج ہی پہلا دن تھا چھٹی کے بعد خالہ کے یہاں گئی ہوگی۔ وہ دیکھو وہ آ گئی!! روزی آ گئی اُس نے میری طرف دیکھا...... آیئے نا! اندر ...... ممی خالہ نے سلام بھیجی ہے میں نے حکم کی تعمیل کی۔ دس بیس منٹ ان لوگوں کے ہاں بیٹھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ روزی نے مجھے کہا کہ اُن کے وارڈ ممبر نے اُسے ملازمت دلوائی ہے یہ لوگ اس پارٹی کے تھے اور اُسے ووٹ دیئے تھے'' واہ! آپ کا ممبر تو اچھا آدمی ہے۔ رہا ہمارا ایم ایل اے تو وہ ایک دم اُلو کا پٹھا ہے۔ روزی اور روزی کی ممی دونوں ہنسنے لگے...... وہ کیوں؟...... روزی نے پوچھا! میں نے اس کے لئے رات دن ایک کیا۔ بہت کام کیا نہ صرف میں نے بلکہ دوسرے میرے جیسے کئی بے روزگار نوجوانوں نے اُس کے جلسوں میں نعرے لگائے، تقاریر کیں، پوسٹر لگائے، ایجنٹوں کا کام کیا اور ہم کو صرف اُس نے وعدہ فردا پر ٹال دیا۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو روزانہ اجرت پر اُس کا کام کرتے رہے۔ ایک نعرے کو ایک روپیہ لیتے تھے۔ اگر صبح سے شام تک 100 نعرے لگائے تو 100/100 روپے لے کر گھر چلے گئے۔ کسی نے پانچ مالائیں پہنائیں تو روپے لے کر گھر سدھارے، رہے ہم نہ ادھر کے نہ اُدھر کے روزی دلچسپی سے میری گفتگو سنتی رہی۔ رخصت ہوتے وقت میں نے پوچھا...... آنٹی وہ آپ کا مرغا اور مرغی بھی آج چھت پر نظر نہیں آئے

......"مرغا تو ابھی تم نے دیکھا......مرغی کو میں نے انڈوں پر بٹھا دیا ہے۔ یہ بیچارہ اب اکیلا رہ گیا ہے بہت اُداس ہے۔

میں کمرے میں واپس آ گیا کافی دیر تک سوچتا رہا۔ فقیر کو بھی روزگار کا وسیلہ مل گیا' روزی کو روزگار مل گیا۔ مرغی بھی 21 دن کے بعد بال بچوں والی ہو جائے گی اور میں......!

سامنے طاق پر رشیدہ خاتون کا ایک ناول پڑھا تھا۔ میں نے اُٹھا کر وہی پڑھنا شروع کر دیا...... روزی کے گھر آنا جانا اب میرے ٹائم ٹیبل میں شامل تھا۔ ایک دن روزی کی ممی کہنے لگی...... بیٹے میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں......تم اگر سننا پسند کرو تو کہوں......ممی یہ بھی کوئی بات ہوئی ہم تو اجازت لئے بغیر آپ سے گھنٹوں باتیں کرتے ہیں......وہ تو اور بات ہے ٹھیک ہے لیکن یہ بات ذرا دوسرے قسم کی ہے! بیٹے میں چاہتی ہوں کہ تم کو اپنا بیٹا بنالوں......" ٹھیک ہے اس میں کون سی پوچھنے والی بات ہے!! تمہاری یہی سادگی مجھے اچھی لگی...... میرے کہنے کا مطلب یہ تمہاری اور روزی کی شادی......!!تم خاموش کیوں ہو گئے......ممی میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اس کا کیا جواب دوں! میں کل آپ کو سوچ کر جواب دوں گا۔

تین دن مسلسل غور کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا......میں اس شادی سے انکار کر لوں۔ لیکن ممی تیسرے دن میرے کمرے میں آ گئی......اور بیٹھتے ہی بے تکلفی سے بولیں......تو کیا سوچا ہے تم نے" یہ اچانک حملہ تھا اور میری جیب حلق سے نیچے اتر گئی۔ میں چند ثانئے خاموش رہا پھر کوشش کر کے آواز نکالی......آپ کو میں نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اپنے مستقبل کا خود مالک ہوں......لیکن آپ جانتی ہیں کہ میں بے روزگار ہوں۔ میں ٹیوشن پڑھا کر اپنا گزارہ چلا رہا ہوں۔ میری دوسری ماں اور میرے باپ بھی ایک کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں۔ میں جب بھی گھر جاتا ہوں تو چچا کے گھر ٹھہرتا ہوں۔ میرے چچا اور میرے چچازاد بہن بھائی مجھ سے بہت پیار

کرتے ہیں۔ شادی تو کوئی گڑیوں کا کھیل نہیں۔ میرے والد صاحب کی مالی پوزیشن بہت کمزور ہے۔ اُن کی دوسری بیوی سے اُن کو پانچ لڑکے اور لڑکیاں ہیں تین جوان ہیں اب بتائیے ان حالات میں میرے لئے شادی کرنا ممکن ہوگا......؟

یہ تو ٹھیک ہے......لیکن تم چاہو تو میرے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر ہمیشہ رہ سکتے ہو......میرا بیٹا جو ابھی نابالغ ہے اُسے بھی سہارے کی ضرورت مل جائے گی۔ تمہاری شکل میں اُسے ایک بڑا بھائی مل جائے گا اور تو کوئی بات نہیں؟......"

لیکن ممی ان کے لئے آپ کسی اور کو ڈھونڈیں تو بہتر ہے جو برسر روزگار ہو۔ جو روزی کو بھی پسند ہو......!" "روزی کو تو تم ہی پسند ہو سنا......"؟ "اوہ......"!! دیکھو بیٹے تم پڑھے لکھے ہو! آج نہیں تو کل تمہیں نوکری مل ہی جائے گی۔ فی الحال روزی کو روزگار ملا۔ میں تمہارے روزگار کے لئے کوشش کروں گی......"

مجھے ہاں کہنے میں تامل نہ تھا......کیوں کہ روزی کو روزگار ملا تھا......اور مجھے روزی ......روزی......روزی......

آوٹ آف ڈیٹ

ہوٹل فارگٹ می ناٹ کے وسیع ع عریض لان کے ایک گوشے میں دو نوجوان لڑکے اور ایک ہپی نما لڑکی کافی میں مصروف تھے۔ اتنے میں ایک اور نوجوان لڑکی آ کر اُن کے ساتھ شامل ہو گئی۔ ایک نوجوان نے اپنا کپ اس لڑکی کے ہونٹوں سے ٹکرایا اور پھر غٹ غٹ کر کے اسے پی گیا۔ دوسری لڑکی غصیلی نگاہوں سے اُس لڑکے کی طرف گھور رہی تھی۔ اچانک وہ نوجوان بولا

''طارق ...... بھی آ گیا......'' سبھوں نے مین گیٹ کی طرف دیکھا۔ طارق لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اُن کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا......'' اُس نے آتے ہی کہا'' گڈ آفٹر نون ٹو آل آف یو......!

''ہیلو مسٹر طارق ...... ہم تماہری طرف سے انویٹیشن کارڈ کی توقع رکھتے تھے...... لیکن تم خود ہی آ گئے ...... چلو اچھا ہوا...... ہپی نما لڑکی نے شوخی سے کہا......!

''انویٹیشن کارڈز ......؟ بھلا کس بات کے......؟'' طارق نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بظاہر خشک سے لہجہ میں پوچھا......'' ایک نوجوان نے بیرے کو پانچ بوتلیں مزید کھول کر لانے کی ہدایت کی۔ ''تمہاری شادی کے......!'' وہی لڑکی بولی۔

''ارے ابھی تو ایک ماہ تک تم سب کو ویٹ کرنا ہوگا......!

''لیکن طارق تم بھی پکے بدھو بلکہ پہلے درجے کے احمق نکلے'' ایک نوجوان نے گلاس خالی کرتے ہوئے کہا'' کیوں......؟'' طارق کی بھویں تن گئیں......!

''اس لئے کہ ہم تمہیں بیسویں صدی کا ترقی پسند نوجوان کہتے تھے اور تم نکلے ستارہوں صدی کے پھکڑ مولوی ٹائپ آدمی......''

''اس ساری تعریف کا مفہوم ہے۔ آوٹ آف ڈیٹ......!''

''ہی ہیز نو ڈسکریشن آف ہز اون......''

''اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے......؟''

''ایک دم ایسی شادی سے انکار......اپنی مرضی اور پسند کی لڑکی سے شادی!''

''لیکن ماں باپ کا بھی تو کچھ حق ہے ہم پر......''

''ماں باپ......؟! ارے جب اُن کی اپنی شادی ہوتی تو وہ بھی اُس وقت ہمارے جیسے جذبات رکھتے ہوتے......'' اتنے میں بیرا آکر پانچ کھلی ہوئی بوتلیں میز پر رکھ گیا......اور ایک لڑکی گلاس میں بیرانڈ بلنے لگی۔

''یہ سب باتیں فرضی ہیں'' رکھتے ہوئے'' کیوں کہتے ہو تمہیں اس میں کوئی شک ہے!''۔ ''تم ٹیلی ویژن آرٹسٹ ہو۔ خوبصورت بھی ہو سمارٹ بھی تمہارا چہرہ جاذب نظر ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی تم پر جان نچھاور کرسکتی تھی......!''

''اور اگر میں ٹیلی ویژن آرٹسٹ اور خوبصورت یا سمارٹ نہ ہوتا تو......!'' تو کیا؟ تب دیکھا جاتا......!''

''اس وقت ہم بھی تمہیں مشورہ نہیں دے رہے ہوتے......لو پیو......چیرز......!''

''سلیم......شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میری وڈبی کتنی خوب صورت اور اچھی ہے؟''

''تو پھر اُس کو یہاں کیوں نہیں لے آئے۔ نظر تو نہیں لگ جائے گی شریف زادی کو......!

"صوفیہ...... ہاتھ کی پانچ انگلیاں ایک جیس نہیں ہوتیں تم بھی لڑکی ہو۔ وہ بھی لڑکی ہے۔ اُس میں اور تم میں فرق بھی تو یہی کہ......" ہاں ہاں...... آگے کہو...... کیا فرق ہے......؟

صوفیہ (ہپی ٹائپ لڑکی) بولی۔

"...... کہ وہ...... چراغ خانہ بننا پسند کرتی ہے اور تم شمع محفل......"

"واہ...... واہ...... کیا شاعرئ ہے۔ چراغ خانہ...... شمع محفل......" ہونہر...... تم بوائے فرینڈ کہلوانے کے حقدار نہیں ہو......!"

"اب تم لوگ چاہتے کیا ہو......؟" طارق نے بیر حلق سے اُتارتے ہو کے پوچھا

......"تم نے ہمارے لئے ایک مثال قائم کردی ...... ہم بھی اپنی مرضی کے مطابق اپنی شادی نہیں کرسکیں گے!" تو کیا برا ہوا؟ یہ تو نیک فال ہے۔ ایک سماجی اصلاح ہے!"

"ہائے ہائے سوشل ریفامر صاحب...... سوچو کہ ہم چار پانچ ہی اس دنیا میں نہیں رہتے"

"چلو اوروں کے لئے مثال تو قائم ہوگئی......" ہوگئی کہاں......۹ ہوتی تب۔ جب تم شادی کرتے اور ہم تمہاری پیروی کرتے۔ ابھی تو دلی کوسوں دور ہے......!"

"کامریڈ دلیپ تم کیوں خاموش ہو۔ تمہارا اور مارکسزم بیچ اس مسئلے کے کیا فرماتا ہے؟"۔ "ہوں...... ہمیشہ کنوارا رہنا......!"

"چلو چھٹی...... اب کوئی اور بات کرو......!"

"بات سے بات نکلتی ہے۔ تو کیا تم اور کامریڈ سروج فرینڈ شپ سے آگے نہیں بڑھو گے......؟!!" "ممکن ہے نہیں" سج نے جواب دیا۔

"اور تمہارے درمیان تنہائیوں کی ملاقاتوں کا انجام......؟" طارق نے لقمہ دیا۔

"ابارشن اینڈ سو آن......"

"دھت تیرے کی......" سروج نے برا سا منہ بنا ک سلیم کو کوسا۔

''اور صوفیہ......تم نے تو یہی کٹ اپنالیا ہے۔اب سلیم کی دوستی جھاڑ کر کئی ہپی کلٹ اپناؤ گے'' ''تم سب اُلو کے پٹھے ہو'' ایڈیٹ سب تم یہ بھول جاتے ہو کہ فرینڈ شپ کس لئے کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے میری دوستی کا مقصد صرف یہ ہو کہ میں تم لوگوں کو نزدیک سے محسبیوں اور پھر کسی ایک کو اپنالوں......ویسے میری نظر طارق پر تھی لیکن

''ہم اُسے تمہارے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کر دیں گے......!''

''وہ شادی تب ہو گی جب میں پہلی بیوی کو طلاق دے دوں......!''

''اُس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اُن لوگوں نے اپنے شیشہ میں اُتار لیا ہے......!''

''جی نہیں ...... میں نے والدین کی مرضی کے آگے گردن جھکا دی ہے۔ ویسے تم لوگ شاید یہ سن کر حیران رہ جاؤ گے کہ میں نے اپنی وُڈبی کو دیکھا تک نہیں ہے صرف سنا ہے کہ وہ خوبصورت ہے اور آٹھ جماعت تک پڑھی ہے!''

''طارق تم اپنی جوانی اور سٹیٹس کو برباد کر رہے ہو......!''

''اگر لڑکی کو شادی سے پہلے دیکھ اور پرکھ لیا جائے تو اچھا ہے؟''

''اب سنو! میں نے کبھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں عین نکاح کے موقع پر یہ مطالبہ کروں گا کہ میں لڑکی کو دیکھنا اور اُس کیس اتھ کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں......!'' سبوں کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اچانک دلیپ کے ہونٹوں سے نکلا ''ہوئی شاباش......!''

''ونڈر فل......!'' سلیم چلایا ''طارق۔ زندہ باد'' صوفیہ نے نعرہ لگایا۔

☆

طارق دُلہا بنے براتیوں کے بیچ بیٹھا تھا اور مولوی صاحب اُس کے ساتھ دو زانو بیٹھے تھے۔ خطبہ ختم ہوا تو حسب دستور مولوی صاحب نے طارق سے کچھ پوچھنا شروع کیا

"سلیم، نصرین، جمیل، سلطان اور دوسرے دوست اُس کی طرف گہری توجہ سے دیکھ رہے تھے اچانک طارق کے لب ہلے اور مولوی صاحب پیچھے کی طرف گے۔ اُن کے چہرے پر اچانک کچھ پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے لیکن طارق کے سارے دوست مسکرانے لگے۔ مولوی صاحب نے طارق سے پر کچھ کہا اور طارق نے بھی کچھ جواب دیا۔ مولوی صاحب تھوڑی دیر کچھ سوچتے رہے پھر دولہا کے باپ کو بلا کر اُن کے کان میں کچھ کہنے لگے۔ پھر دلہن کے باپ کو بھی کہا گیا۔ اس درمیان سارے براتیوں کی توجہ اُن کی طرف ہو گئی تھی اور سب ایک دوسرے کے منہ تکنے لگے تھے۔ مولوی صاحب کھڑے ہو گئے اور دلہا دلہن دونوں کے باپ اُن کے ساتھ ہی کھڑے ہو گئے اور پھر وہ باہر نکل گئے۔" چند لمحوں کے بعد ایک آدمی آیا اور طارق کے کان میں کچھ کہا۔ طارق کھڑا ہو گیا اور اُس کے ساتھ ہی وہ بھی باہر نکل گیا۔ براتیوں میں کانا پھوسی شروع ہو گئی۔

☆

جس کمرے میں دلہن کو رکھا گیا تھا وہاں اور کوئی نہ تھا۔ طارق کمرے میں داخل ہوا۔ دلہن کھڑی ہو گئی۔ اُس کی گردن جھکی ہوئی تھی ہلیکن گھونگھٹ نام کی کوئی چیز اُسکے چہرے پر نہ تھی۔ اُس کی آنکھیں بھی جھکی ہوئی تھیں"

"آپ کا نام؟" ریحانہ "تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟"

"جہاں تک شرافت، حیا اور ماں باپ اور شوہر کی اطاعت کا سبق درج ہے"

"آپ کا مطلب!" "جو آپ اچھی طرح سے سمجھے!" آپ میری طرف دیکھئے"

"ریحانہ نے سر اُوپر اُٹھایا" اوہ...... مائی گاڈ......!"

"اور کچھ امتحان لینا ہے تو جلدی کیجئے!"

"آپ کمرے میں تھوڑا سا ٹہلنا پسند کریں گی۔" جواب میں ریحانہ نے کمرے

کے دو مرتبہ چکر لگائے۔ طارق کو اب اچھی طرح سے معلوم ہو گیا تھا کہ ریحانہ واقعی ایک مکمل اور بھرپور مجسمہ شرافت' انسانیت اور حیا ہے وہ نہ تو اندھی تھی نہ لنگڑی نہ گونگی نہ بہری۔ بس اور کیا تھا؟

"ٹھیک ہے آپ تشریف رکھیئے" وہ واپس جانے کو مڑا......"

"سنیئے......!" "ریحانہ کی ترنم آمیز آواز کی آئی" فرمائیے......" "کیا اب میں آپ کو پسند ہوں......؟" "جی ہاں۔ بسر و چشم!" "لیکن اب باری میری ہے!"

"جی......؟" "میں بھی آپ سے چند سوالات پوچھنا چاہتی ہوں!" "پوچھیے

"آپ کو ایسا کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی......!" یہ زمانے تقاضہ۔

"کیا ہمیں زمانے کے ساتھ چلنا چاہیے یا زمانے کو اپنے ساتھ چلانا چاہیے!"

"میں آپ کا مطلب سمجھا لیکن!" "طارق صاحب یہ ٹیلی ویژن نہیں جہاں آپ کو لاکھوں لوگ ایکٹنگ کرتے دیکھتے ہیں یہاں ایک آپ ہیں اور میں ہوں۔ اس لئے ایکٹنگ کی ضرورت نہیں! آپ مجھے صاف صاف بتائے کہ اگر میں خوبصورت نہ ہوتی یا مجھ میں کوئی جسمانی عیب ہوتا تو کیا آپ مجھے ٹھکرا دیتے......!"

"............" "کیا آپ کو بیوی کی ضرورت ہے یا پڑھی لکھی خوبصورت ماڈرن اور فراٹے سے انگریزی بولنے والی گڑیا کی......" "فرض کیجئے......آپ کی کوئی بہن بدصورت یا گونگی ہوتی اور معمولی پڑھی لکھی ہوتی اور کوئی لڑکا آپکی طرح اُسے دیکھنے کے بعد شادی کرنے کی شرط باندھتا ہے اور وہ بھی عین نکاح کے موقع پر تو آپ پر اُس وقت کیا گزرتی؟" اگر ہر نوجوان نے یہی شرطیں باندھنا شروع کر دیں تو بدصورت مگر شریف باحیا' سلیقہ شعار غریب لڑکیوں کا کیا ہوگا۔ کیا وہ بن بیاہی ہی اس دنیا سے کوچ کر جائیں گی۔ آپ نئے زمانے کی باتیں کرتے ہیں لیکن آپ یہ نہیں سوچتے کہ آپ خود پرانے زمانے کی پیداوار

ہیں اور آپ کے والدین پرانے ہو جاتے ہیں کیا۔ اُن کو بھی آپ صرف اس وجہ سے اپنا باپ یا ماں کہنے سے انکار کر دیں گے کہ وہ پرانے زمانے کے لوگ ہیں۔ تو آپ کہاں ہوتے؟ کل آپ کے بچے آپ کو اَوٹ آف ڈیٹ کہیں گے۔

میں آپ کو معاف نہیں کر سکتی؟ کیونکہ آپ میرے امتحان میں ناکام ہو گئے ہیں۔ مجھے آپ سے شادی منظور نہیں!'' پہلے آپ کو میں منظور نہ تھی اور اب دیکھا تو میری خوبصورتی نے مرنے لگے مجھے آپ پہلے منظور تھے اب آپ کی ظاہری خوبصورتی اور باطنی بدصورتی دیکھی تو اب آپ مجھے پسند نہیں جایئے چلے جایئے یہاں سے اپنی نئی دنیا بسایئے۔''
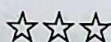
”چھینک“

سائنسدانوں نے چھینک کو ایک فطری عمل سے تعبیر کیا ہے جو ہر اس ذی روح سے جڑا ہوا ہے جو اس روئے زمین پر موجود ہے لیکن ان جانداروں Living Things or of din میں نباتات شامل نہیں، حالانکہ وہ بھی کاربن ڈائے آکسائیڈ پیتے ہیں لیکن بظاہر ان کی ناک نظر نہیں آتی اُن کو چھوڑ کر جس جاندار کی ناک ہمیں اپنی کھلی آنکھوں سے نظر آتی ہے اُن کا چھینک کے ساتھ فطری رشتہ ہوتا ہے کیونکہ ناک اور چھینک کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس طرح سے چھینک بغیر ناک کے نہیں آسکتی اسی طرح کوئی ناک بغیر چھینک کے نہیں ہوسکتی۔

چھینک دراصل ناک کے پچھلے حصے میں کھوپڑی کے اندر خلیوں میں چھپی رہتی ہے اور اس کے باہر آکر آواز کے ساتھ خارج ہونے کے کئی اسباب ہیں۔ اس کے مخصوص آواز کے ساتھ خارج ہونے کے راستے صرف نتھنے ہیں ہیں۔ کبھی کبھی ایک ساتھ چھینکوں کا ہجوم باہر آنے کی سعی کرتا ہے اور ایسے موقعوں پر جب بھیڑ میں نظم و ضبط نہ رہے تو Stemped کی وجہ سے کئی کمزور اور ناتواں قسم کی چھینکیں ناک کے اوپری تاریک سرنگ کے اندر توانا چھینکوں کی بدتمیزی اور بدنظمی کی پاداش میں کچل کر رہ جاتی ہیں اور کچھ بھاگ کر اور ٹنل سے ہٹ کر دائیں بائیں سے جن میں گلا بھی شامل ہے خارج ہو جاتی ہیں لیکن دھکم دھکے میں ناک، حلق اور کھوپڑی کے اندر حساس اعضاء کو بہت تکلیف پہنچتی ہے اور

آنکھیں رونے لگتی ہے۔

جاندار چیزوں میں ایک حقیر سے کیڑے یا مچھر سے لے کر ہاتھی تک حیوان بھی شامل ہیں لیکن مچھر، مکھی، کھٹمل، چیونٹی، جھینگر، دیمک جیسے گھریلو کیڑوں کی چھینک اگرچہ ہم نے نہیں سُنی ہے لیکن اغلب ہے کہ یہ مخلوق خداوندی بھی ضرور چھینکتے ہونگے کیونکہ آخر یہ بھی تو ناک رکھتے ہیں۔ باقی رہے گائے، کُتا، مینڈھا، بکری، بھینس، اُنہیں ہم نے نہ صرف اپنی آنکھوں سے چھینکتے دیکھا ہے بلکہ اپنے کانوں سے سُنا بھی ہے۔

اب رہا سوال حضرت انسان کا...... یہ اشرف المخلوق ہے اور ہر چیز پر غالب ہے لیکن چھینک ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر یہ غالب نہیں۔

چھینک اور موت ظرف زمان وظرف مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ موت کی طرح چھینک بھی بلالحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل، ذات وجماعت، عمروجنس ورتبہ آتی ہے اور رات ہو دن، صبح ہو یا دوپہر، شام ہو یا کوئی اور وقت اس کو آنا ہے تو آکر رہے گی۔ آپ گھر میں ہوں، باتھ روم میں ہوں، تخت پر براجمان ہوں، عدالت کی کرسی پر ہوں، مسجد یا گرجے میں ہوں، ہوائی جہاز ہو یا ریل گاڑی میں ہوں، فٹ پاتھ پر سوئے ہوں یا کلاس روم میں ہوں، چھینک ہر جگہ بغیر اجازت مانگے چلی آئے گی۔ نہ بادشاہ کی فوج اسے رُکا پائے گی نہ جج صاحب کا چپراسی، نہ ہیڈ ماسٹر کا ڈنڈا، نہ ہوائی اڈے کا سگنل ٹاور، نہ گارڈ کی جھنڈی، نہ امام صاحب، نہ کوئی اور...... چھینک کو آنا ہوگا...... تو ضرور آئے گی۔

ہم نے اہل چھینک کا قریب سے بغور مشاہدہ کیا ہے جب کسی کو چھینک آنے لگتی ہے تو پہلے دھیرے دھیرے سے اس کا منہ کھلنے لگتا ہے، ہونٹ سکوڑ لیتا ہے، آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ بھنویں تن جاتی ہیں، منہ کھڑے سینے کی طرح ہو جاتا ہے اور نتھنے اوپر کی جانب تن جاتے ہیں۔ اوپر کی سانس اوپر، نیچے کی نیچے اور پھر ہلکی سی آواز ''آچھی'' کے ساتھ

چھینک باہر آجاتی ہے اور طوفان ٹل جاتا ہے۔ سانسیں پھر چلنے لگتی ہیں۔ دل دوبارہ دھڑکنے لگتا ہے، اس درمیان وہ شخص جو اس کیفیت سے گزرا ہوتا ہے چند ثانیے تک بالکل حیران و پریشان رہتا ہے، اسے کچھ یاد نہیں آتا کہ دوران چھینک اسے کچھ سوچا تھا یا نہیں، وہ کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا، خواہ وہ کتنا بڑا مفکر، سائنس دان یا فلاسفر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا انتہائی تیز ذہن بھی دوران حالت چھینک ماؤف ہو کر رہ جاتا ہے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے، حرکت قلب رُک جاتی ہے وغیرہ وغیرہ...... ایک معمولی سی چھینک سے انسان کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔

اگر چھینک مسلمان کو آجائے تو وہ الحمدللہ پڑھتا ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ بچ گئے سانس واپس آگئی اور جس نے چھینک سنی ہو اور اگر مسلمان ہو تو اس کیلئے یَرحَمُکَ للہ پڑھنا ضروری یعنی اللہ نے رحم فرمایا۔ یہ مقدس کلمات شکریہ اور "رحم" پڑھنے کے پیچھے کیا راز ہے؟ بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ یہ چھینک ایک چھوٹی سی قیامت ہوتی ہے اور موت کی وارننگ...... بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ چھینک آئی سانس رُک گئی اور پھر ہمیشہ کیلئے رکی ہی رہی۔ دراصل اس کا دل کے ساتھ گہرا رشتہ ہے ورنہ ایک معمولی چھینک کی کیا بساط۔ انسان تو گولیوں، توپوں، بموں اور طوفانوں جسے نہیں گھبراتا اور ایک معوملی سی چھینک آنے سے اسے خدا یاد آجاتا ہے۔

ایک ڈکٹیٹر فوجی حکمران ایک مرتبہ اپنی حکومت کے بڑے بڑے اعلیٰ آفیسروں اور اعلیٰ فوجی جرنیلوں کو خطاب کر رہا تھا "ہمارے پاس طاقت ہے، دماغ ہے، دولت ہے، بہادری کے کارناموں سے ہمارا نام اونچا ہے...... اتنے میں اس کی ناک اوپری حصے میں کلبلاہٹ سی ہوئی، ارتعاش سا ہوا اور وہ کہتے کہتے رُک گیا، اس کا منہ کھل گیا۔ چھینک آئی تو اس کی بڑی بڑی موچھیں نیچے لٹک گئیں، آنکھیں بھر آئیں، چھاتی پر سجے ہوئے سونے

چاندی اور بہادری کے تمغے جھولنے لگے۔اس کی جرنیلی ٹوپی اس کے آگے، قدموں میں جا گری......اور پھراس کے اپنے ہوش وحواس درست کرنے کے بعد جب ٹوپی پھر سر پر سجائی تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے لہجے میں بھی تھرتھراہٹ تھ' کہنے لگا''ہم ساری دُنیا کو کیا ہلا سکتے ہیں۔ایک چھوٹی سی چھینک نے میرے سارے وجوداور سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا۔ بھائیو......خدا کا خوف کرو''۔

چھینک ہر موسم میں آسکتی ہے لیکن جو چھینکیں جاڑے کے موسم میں آتی ہیں وہ زکام ہو جانے کا عندیہ دیتی ہیں اوران چھینکوں سے نتھنوں سے نزلہ خارج ہوتا ہے' ناک کے اندر کا رقیق بادہ ٹھنڈا پانی بن کر نتھنوں سے ٹپکنے لگتا ہے۔رعشے کی چھینک کی علامت یہ ہوتی ہے کہ ہر ایسی چیز جسے کھانے والے کا مزاج قبول نہ کرے ایک قسم کے زکام کو مرتعش کر دیتا ہے۔کبھی کبھی میٹھی چھینکیں آتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ کوئی یاد کر رہا ہے' ان چھینکوں کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا' جیسے ایس ٹی ڈی یا آئی ایس ڈی فون کال آجائے اور گھنٹی بجنے لگے' اس طرح سے دور سے کوئی یاد کرتا ہے تو ناک کی گھنٹی ''آچھی'' کی آواز کے ساتھ بج اُٹھتی ہے اور چھینک سے فارغ ہونے کے بعد اہل چھینک کہتے ہیں کہ کسی نے یاد کیا' بعض اوقات چھینک کو براشگون مانا جاتا ہے' خصوصاً جب کوئی سفر پر روانہ ہو اور کسی کو چھینک آجائے تو چھینکنے والے کو نفرت سے دیکھا جاتا ہے اور مسافر تھوڑی دیر اپنا صفر ملتوی کر کے چند ثانیوں کے بعد پھر سفر شروع کرتا ہے۔

بہر حال چھینک سیکولرازم' مساوات اور سوشل ازم کی ایک بہترین مثال آ......آ......آ......آ......آچھی......:الحمدللہ۔

☆☆☆

YE KIS KIY LASH HAI MERE KAFAN MAIN

By

RAJA NAZAR BONYARI

☆......راجہ نذر بونیاری ایک معروف افسانہ نگار ہیں' وہ ریاست کے ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کے افسانے ملک کے کچھ موقر اور اعلیٰ معیار رکھنے والے جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ میں نے اُن کی کچھ کہانیاں پڑھی ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اُن کی تحریر میں اپنی ریاست کی سماجی حالات خصوصاً یہاں کے لوگوں کے مسائل اور مشکلات کی جھلکیاں صاف عیاں ہیں۔ **ڈاکٹر حامدی کاشمیری** (انگریزی سے ترجمہ) ماخوذ

☆......میں نے راجہ نذر بونیاری کی کہانی ''پورا چاند اور آدھی رات'' سنی اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس میں کہانی پن اور کہانی کے دوسرے لوازمات موجود ہیں۔ کردار دو ہی ہیں' یہ مجھے اچھا لگا لیکن ابہام کہانی کے اندر نہیں ہونا چاہیے۔ جو کچھ کہنا ہے کھل کر کہو۔ مظہر امام نے ٹھیک ہی کہا' کہانی پر رپورتاژ کا گماں نہیں ہونا چاہیے۔ (**عصمت چغتائی**)

ایک ادبی نشست میں کی گئی تقریر سے اقتباس۔

یہ نشست بارہمولہ میں آنجہانی تیج بہادر بھان کے گھر پر منعقد ہوئی تھی)

☆......راجہ نذر بونیاری ایک افسانہ نگار' شاعر' جرنلسٹ اور گلوکار ہیں' اُن کی کہانیاں میں نے اپنے ادبی میگزین پروگرام ''خرمن'' میں نشر کی ہیں' اُن کی کہانیوں کے مرکزی کردار سماج کے سب سے پچھڑے طبقوں سے ہوتے ہیں۔ وہ اردو ادب میں ترقی پسند رجحانات سے متاثر لگتے ہیں۔ ''یہ کس کی لاش ہے میرے کفن میں'' اور ''دوسرا آدم'' جیسی کہانیوں کو جدید اردو افسانے کی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ **کمال احمد صدیقی** (انگریزی سے ترجمہ) ماخوذ

سابق چیف پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو

☆......مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ میں نذر بونیاری کو ذاتی طور پر ایک اُبھرتے ہوئے کہانی کار اور صحافی کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ وہ کئی برسوں تک ''چنار'' کے ساتھ وابستہ رہے اور ماہنامہ ''علم و دانش'' کے مدیر اعزازی بھی رہے۔ اُن کی کہانیوں میں ''کشمیریت'' کوٹ کوٹ کر بھری ہے' ان کی کہانیوں کے کردار دیومالائی نہیں ہوتے بلکہ انہیں وہ اپنے آس پاس کے ماحول سے منتخب کرتے ہیں۔ چراغ حسن حسرت کے بعد اس علاقے سے نذر بونیاری کا نام سنا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد (انگریزی سے ترجمہ) ماخوذ